جولائی-اگست 2008

میڈیا مانیٹر

ممبران کے لئے
نیوز لیٹر

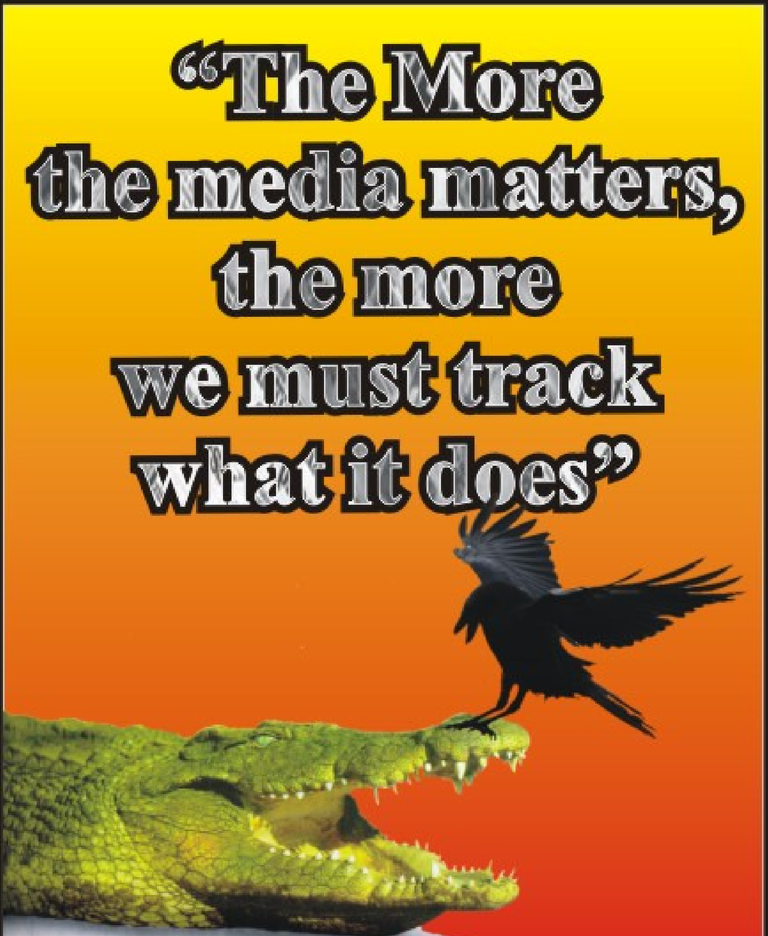

کیا کسی ٹی وی چینل پر یہ خبر
ٹاک شو
کا موضوع بن سکتی ہے یا نہیں؟

لڑکے کا کہنا ہے
"اہل خانہ کی بھوک کی شدت کے باعث میں نے آٹا چرایا"

میرپور خاص، 22 اگست: ایک نوعمر لڑکا یہاں جمعہ کے روز ایک دکان سے دو کلوگرام آٹا چرانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ تاہم کونسلر کی مداخلت سے تقریباً تین گھنٹے حراست میں رہنے کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔

ستار نگر کا رہنے والا 13 سالہ گوردھن میگھوار کا کہنا ہے کہ اس کی ماں اور دس سالہ بہن گذشتہ تین دن سے بھوکی تھیں جس کے باعث وہ مجبور ہوا کہ آٹے کی چوری کرے۔ اسکے باپ کا ایک سال قبل انتقال ہو چکا ہے اور بڑا بھائی بے روزگار ہے۔

یہ لڑکا ایک دکان پر کام کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ دکاندار نے تین ہزار روپے (-/3,000) تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اس نے مجھے صرف -/1,500 روپے دیے۔ اس نے بتایا کہ میں اس دکان سے ادھار سودا سلف لیتا رہتا ہوں مگر اب جب میں نے آٹا ادھار مانگا تو دکاندار نے نقد پیسوں کا مطالبہ کیا جو میرے پاس نہیں تھے۔ اس نے کہا میں اپنی ماں اور بہن کو بھوکا نہیں دیکھ سکا جو ٹی بی کی مریض ہیں اس لئے آٹا چرانے پر مجبور ہوا۔

اس واقعے کے بعد سابق صوبائی وزیر ہری رام کشوری لعل نے اس کے بھائی کو اپنی فلور مل میں ملازمت دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ میرپور خاص کے تعلقہ ناظم غلام دستگیر کمالی نے ایم کیو ایم کے رہنما الطاف حسین کی ہدایت پر اس کنبے کو ایک ماہ کا راشن فراہم کیا ہے۔

(روزنامہ ڈان 23 اگست)

1 میڈیا ڈکٹیٹرشپ اور نظریے کی موت
2 ہمارے اخبارات میں کیا کمی ہے؟
3 کیا میڈیا عوام کے لئے محض افیون ہے؟
7 سیاستدانوں کو بدنام کرنے میں انٹرنیٹ کا حصہ

سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ

(Society for Alternative Media and Research)

عوام پر مرکوز میڈیا کی شدید ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ملک اور معاشرے میں سماجی تبدیلی اور انصاف کے علمبردار کچھ لوگوں نے اسلام آباد میں سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ (Society for Alternative Media and Research) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جو سوسائٹیز ایکٹ 1860 کے تحت رجسٹرڈ ہے جس کا مقصد عوامی مسائل کے بارے میں عوامی نکتہ نظر کو مناسب انداز میں پیش کرنا ہے تاکہ وسیع البنیاد جمہوری مباحثے اور عمل کو فروغ ملے۔ اس گروپ میں عوامی حقوق کے سرگرم رکن، امن کے حامی، ماہرین، مختلف ماحولیات کے کارکن، میڈیا اور صحافت سے وابستہ لوگ شامل ہیں جو "مال کماؤ" ایجنڈے پر عمل پیرا مقتدر میڈیا کو لوٹ مار میں ملوث حکمران طبقات کا حصہ سمجھتے ہیں۔

SAMAR کی رہنمائی ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے جس کا یقین ہے کہ حقیقی علمی پس منظر کے بغیر میڈیا فوری اور سرسری کوتاہ نظری کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسے میڈیا کے متبادل تصور پر یقین رکھنے والے صحافیوں اور محققین کی ٹیم چلا رہی ہے جسے متبادل پرنٹ اور الیکٹرانک مواد کی تیاری کا تجربہ ہے۔

204، سیکنڈ فلور، کرن پلازہ، ایف ایٹ مرکز، اسلام آباد۔ فون: 051-2855011/022
ای میل: mediamonitor@alternativemedia.org.pk
ویب سائٹ: www.alternativemedia.org.pk

اس شمارہ میں

میڈیا ڈکٹیٹر شپ اور نظریے کی موت 1
ہمارے اخبارات میں کیا کمی ہے؟ 2
کیا میڈیا عوام کے لئے محض افیون ہے؟ 3
آزاد میڈیا شکایات کمیشن کے قیام کا اعلان 4
میڈیا کن کے لئے ہے!!! 4
ناقابلِ اشاعت:
IUF کا وزیر اعظم پاکستان کے نام کھلا خط 5
وزیر اعظم کا دورہ امریکہ اور پاکستانی میڈیا 6
انٹرنیٹ ہر حال ملے گا.... 7
سیاستدانوں کو بدنام کرنے میں انٹرنیٹ کا حصہ
فراز 8
انٹرنیٹ کی سیاسی افواہیں اور
میڈیا کا نوخیز ایکو سسٹم 8
امریکہ میں میڈیا اصلاحات
کی تحریک زور پکڑ گئی 9
بھارتی میڈیا کا سوشل پروفائل 9
اشتہاروں میں خواتین کا استحصال 10
موبائل فون: باہمی رابطوں....
یا موجودہ رشتوں میں بگاڑ کا ایک ذریعہ 11
تمباکو نوشی کے موضوع پر
بھارتی نوعمر لڑکی کی ڈاکومنٹری 12
قلم رو/ Page 3 13
14

ایڈیٹوریل بورڈ: حارث خلیق، فوزیہ شاہد، عبدالقادر
چیف ایڈیٹر: مظہر عارف۔ ایڈیٹر: ارشد رضوی۔ آرٹ ایڈیٹر: جعفر مہدی۔ مترجم: کوکب جہاں، تحریم اسلم۔ پبلشر: سوسائٹی فار آلٹرنیٹو میڈیا اینڈ ریسرچ۔ پرنٹر:

میڈیا ڈکٹیٹر شپ اور نظریے کی موت

عوامی حکمرانی اور حقیقی سیاسی جمہوریت کے لئے ڈیموکریٹک میڈیا بنیادی شرط ہے جو خود اپنی ساخت، نظم و نسق اور فیصلہ سازی کے معاملوں میں جمہوری اصولوں پر عمل پیرا ہو۔ تاہم اگر میڈیا مقتدر اشرافیہ، چاہے وہ حکمران اور بیوروکریٹ ہوں یا نجی مالکان، کے کنٹرول میں ہو تو ایک طرح کی محدود جمہوریت تو قائم ہو سکتی ہے جس میں چند لوگوں کی شنوائی ہو لیکن ایسی حقیقی جمہوریت نہیں جس میں تمام مزدور، کسان، طالب علم، استاد کی آواز سنی جا سکے۔

آج ہم ایک لحاظ سے رائج الوقت سوچ (Mainstream) کی ڈکٹیٹر شپ کے تحت زندگی گزار رہے ہیں، چاہے یہ ڈکٹیٹر شپ رائج الوقت میڈیا کی ہو، سیاست کی یا علم کی۔ یہ رائج الوقت سوچ ہی ہے جو ہمیں ڈکٹیٹ کروا رہی ہے۔ اس ڈکٹیٹر شپ میں ہمارا دم گھٹ رہا ہے۔ Mainstream میڈیا کی اپنی ساخت (Built-in) کے تعصبات نہایت دیانتداری سے غالب آئیڈیالوجی کی عکاسی کر رہے ہیں اور بھولے سے بھی کوئی ایسی بات نہیں کرتے جو ان لوگوں کو ناگوار گزرے جو سیاسی اور معاشی طور پر مقتدر ہیں، میڈیا مالکان ہیں یا میڈیا ہاؤسز کو اشتہارات دیتے ہیں۔

پاکستان سمیت ایسے ممالک میں، جہاں جمہوری روایات زیادہ مستحکم نہیں، جاننے کے حق (Right to-be-informed) کی مسلسل خلاف ورزی کی جاتی ہے جو لوگوں کے بنیادی حقوق میں سے ایک ہے۔ ان ممالک میں میڈیا عام طور پر (میڈیا مالکان سمیت) مقتدر اشرافیہ اور بزنس و کارپوریٹ سیکٹر کے مفادات کے تحفظ کے لئے زیادہ سے زیادہ سپیس اور ٹائم وقف کرتا ہے۔ جبکہ عام لوگوں کو، جن سے میڈیا کا خطاب ہوتا ہے اور جو اکثریت میں ہیں، کم سے کم وقت اور جگہ دی جاتی ہے۔ اگرچہ ان دنوں پاکستان میں میڈیا کی آزادی کا بہت چرچا ہے۔ یوں تاثر دیا جاتا ہے کہ کھمبیوں کی طرح ان گنت لیکن ہر طرح کے ضابطوں سے آزاد نجی ٹی وی چینلوں کے اُگ آنے سے ملک میں خوشحالی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کریڈٹ کارڈ ہے یا اے ٹی ایم کارڈ ہے اور وہ نئی کار، نئے موبائل سیٹ، شاپنگ مال، فاسٹ فوڈ آؤٹ لیٹ کی جانب بھاگ رہا ہے۔ اینکر پرسن جس معاشی بدحالی کا رونا رو رہے ہوتے ہیں، انہی چینلوں پر ڈراموں، ٹاک شوز، تفریحی پروگراموں اور اشتہارات میں امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ ان کا منہ چڑا رہے ہوتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ملک میں پٹرول کے کنوئیں ابل رہے ہیں۔ ملک کا ہر شہری گلوبل سٹیزن ہے اور اس نے روزانہ دنیا کے کسی نہ کسی کونے میں کسی سے فون پر بات کرنا ہوتی ہے۔ ہر شخص پڑھا لکھا ہے اور بین الاقوامی و سیاسی امور کا ماہر ہے اور بتا رہا ہوتا ہے کہ حکومت کس طرح چلنی چاہیے۔ لیکن زمینی حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

انسانی غربت انڈکس رپورٹ (یو این ڈی پی 2002) کے مطابق پاکستان میں 44 فیصد لوگ تنگ دستی کی زندگی بسر کر رہے ہیں جبکہ عورتوں کو زیادہ مصائب جھیلنا پڑتے ہیں۔ آبادی کی دیہی و شہری تقسیم ایک روز افزوں سماجی مسئلہ ہے۔ ملک کی 65 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے اور اس آبادی کا دو تہائی غربت کا شکار ہے۔ ملک کی تقریباً نصف آبادی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہے۔ آبادی کے 62 فیصد بالغ مرد اور عورتیں لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔ عورتوں کی آبادی کا 76 فیصد ناخواندہ ہے۔ ملک کی 40 فیصد آبادی کو صحت کی بنیادی سہولتیں میسر نہیں جبکہ پانچ سال سے کم عمر کے 38 فیصد بچے خوراک کی قلت کا شکار ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران دیہی غربت میں 9 فیصد اضافہ ہوا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آبادی میں اضافے کی شرح سابقہ ریکارڈ توڑ کر 3.6 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ جبکہ قدرتی وسائل (زمین، پانی، جنگل) تیزی سے معدوم ہو رہے ہیں۔ لیکن یہ مسائل شاذ و نادر ہی کسی ٹاک شو یا بحث مباحثے کا موضوع بنتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں میڈیا کا زور عوام کو ان معاملات سے آگاہ رکھنے کی بجائے، جن سے ان کا براہ راست تعلق ہے، زیادہ سے زیادہ ریونیو جمع کرنے پر لگ رہا ہے۔ صحافیانہ اخلاقیات اندھا دھند ایڈورٹائزنگ بلٹز کا شکار ہو چکی ہیں۔ پاکستانی میڈیا ایمپائرز نے خود کو مقتدر اشرافیہ یا کارپوریٹ سیکٹر کے ایجنڈا کو آگے بڑھانے کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا (ٹی وی، ریڈیو چینلز) کے شتر بے مہار پھیلاؤ کے بعد رائج الوقت میڈیا کے مارکیٹ اور پاور گیم میں مفادات اور بڑھ گئے ہیں، جس کے نتیجے میں میڈیا خود کریڈیبلٹی کے بحران کا شکار ہے۔ اسے زبان کے بحران کا بھی سامنا ہے کیونکہ الفاظ عمومی طور پر اپنے معنی اور تقدس کھو چکے ہیں۔ میڈیا تو پھیلا ہے لیکن اس کا فوکس سکڑ گیا ہے۔

پاکستانی میڈیا میں خود تنقیدی کی روایت نہ ہونے کے سبب یہ خود بھی تصحیح اور اصلاح کے میکانزم سے محروم ہے۔ میڈیا کے اشاعتی اور نشریاتی اداروں میں فیصلہ سازی کا عمل صرف چند لوگوں تک محدود ہے جو عام طور پر افراد خانہ ہی ہیں۔ اخبارات کے کالم نگار اور ٹی وی ٹاک شو کے اینکر پرسن جب سیاست اور سیاستدانوں کو بری طرح رگید رہے ہوتے ہیں تو شاید یہ بھول جاتے ہیں کہ "قوم اور پریس ایک ساتھ ابھرتے اور ڈوبتے ہیں"۔ قوم کا زوال پریس کا زوال بھی ہے۔ اور ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ پاکستانی میڈیا (صحافت) اپنے تاریک دور (Dark ages) میں داخل ہو چکا ہے۔ ایڈیٹر کی جگہ مالکان نے خود سنبھال لی ہے۔ نیوز ایڈیٹر کی بجائے منیجر ایڈورٹائزمنٹ اخبارات میں سپیس کا تعین کرتا ہے جبکہ خبر کا ڈیسک مالک کی صوابدید پر ہے۔ معیاری رپورٹنگ اور ایڈیٹنگ ماضی کا قصہ بن چکے ہیں۔ تربیت، مہارت، اخلاقیات اب میڈیا میں متروک اقدار ہیں۔ پاکستان میں صحافت کا سب سے بڑا نقصان 'نظریے کی موت' ہے۔ صحافت مشن سے انڈسٹری بن چکی ہے۔ انڈسٹری میں نفع کے علاوہ کوئی اور نظریہ نہیں ہوتا۔ سب سے زیادہ بولی دینے والا 'سچ' کو خرید لیتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں میڈیا کے تمام تر ادارے ایک ہی نظریہ کا پرچار کر رہے ہیں اور وہ ہے مارکیٹ اکانومی۔ میڈیا میں آئیڈیاز کا تنوع (Diversity) ناپید ہو چکا ہے۔ ہر اخبار، ہر ٹی وی چینل ایک ہی راگ، ایک ہی دھن میں مست ہے۔ ایک ہی بات دن میں دسیوں مرتبہ سننا پڑتی ہے۔ میڈیا نے کارٹیل کی شکل اختیار کر لی ہے۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ طاقت پکڑنے کے بعد میڈیا کے ادارے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں رہے۔ فوج اور عدلیہ کے بعد اب میڈیا بھی 'مقدس گائے' ہے۔ سیاسی حکومتیں میڈیا کی یلغار سے خوفزدہ رہتی ہیں چنانچہ رولز اور ریگولیشنز بے معنی ہو گئے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بہت سے اخبارات نے اپنے قارئین سے بھی رشتہ توڑ لیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض اخبارات نے 'ایڈیٹر کی ڈاک' کا کالم بھی ختم کر دیا ہے۔ جو قارئین سے رابطہ کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔

دنیا کے بیشتر ممالک کی طرح پاکستان میں بھی میڈیا ریفارمز کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ڈیموکریٹک (ادارے کے اندر جمہوری اصولوں پر عمل پیرا) میڈیا اور میڈیا ڈیموکریسی (مزدوروں، کسانوں، طالب علموں، پھابڑی فروشوں، جھگی نشینوں، اقلیتوں سب کے لئے میڈیا ہاؤسز میں سپیس اور وقت) کے لئے آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ میڈیا اگر انڈسٹری ہے تو اسے انڈسٹریل ریلیشنز کے قانون کے تحت تمام قواعد و ضوابط کا پابند ہونا چاہیے۔ اس صورت میں میڈیا آپریٹرز (مالکان، صحافی) کو ان تمام خصوصی مراعات، عزت و احترام اور سوسائٹی میں خصوصی رتبے سے دستبردار ہونا پڑے گا جو میڈیا سے وابستگی کے سبب انہیں حاصل ہے اور اگر میڈیا صرف کاروبار نہیں تو لالچ اور راتوں رات لکھ پتی سے کروڑ پتی اور کروڑ پتی سے ارب پتی بننے کی خواہش ترک کر کے سماجی اور قومی ذمہ داریاں پوری کرنا ہوں گی۔ لفظوں کے تقدس اور صحافت کی کریڈیبلٹی کو بحال کرنا ہوگا اور...... نظریے کو دوبارہ زندہ کرنا ہوگا۔

(چیف ایڈیٹر)

ہمارے اخبارات میں کیا کمی ہے؟

بدر عالم

اگر ہم روزانہ کے اخبار دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے ہمارے سب سے بڑے مسائل صرف چار ہیں سیاست، جرائم، دہشت گردی اور مہنگائی۔ یوں تو یہ مسائل بجائے خود ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ان میں سے ہر ایک پاکستان کی معیشت، معاشرت اور ریاست کیلئے ایسے گھمبیر مسائل کا منبع اور ماخذ ہے کہ ان کی موجودگی میں مزید مسائل اور مزید ایشوز کی طرف محض اشارہ کرنے کیلئے بھی جگہ چاہئے۔

مگر اس کا کیا کیجئے کہ مسائل جو ہمیں روزانہ در پیش ہیں گوناگوں ہیں اور ان میں سے کئی ایک شاید اس قدر الجھے ہوئے بھی نہیں کہ ان کیلئے اس سیادت کی ضرورت ہو جو آج کی سیاست کو اپنے ہی تخلیق کردہ گھن چکر سے نکلنے کے لئے درکار ہے۔ نہ ہی یہ مسائل ایک ایسے نظام عدل اور امن کی لاحاصل جستجو کے خواہاں ہیں جو دائروں میں گھومنے کے بجائے آگے کا سوچے اور اس پر عمل کرے۔ اسی طرح دہشت گردی اور مہنگائی کے خاتمے کیلئے جس اندرونی اتحاد اور قوت ارادی کے ساتھ بیرونی مداخلت اور عدم مداخلت کے نازک توازن کی ضرورت ہے وہ بھی شاید ان مسائل کے حل کیلئے بہت زیادہ ہے۔

مگر وائے ناکامی کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ ایسے کون سے مسائل ہیں آخر جو ہم اپنی تمام تر تنگ دامنی کوتاہ بینی اور قوت عمل کے فقدان کے باوجود حل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایسے سکولوں کو چلانا کیوں کر مشکل ہے جن کی عمارت بھی موجود ہے فرنیچر بھی اور وہاں استاد اور شاگرد برائے نام ہی سہی مگر رجسٹروں اور کاغذوں میں حاضر اور غیر حاضر بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے اخبار اور اخبار نویس آخر کیوں تگ و دو نہیں کرتے ایسے مسائل کو عیاں کرنے کی۔ اگر کبھی یہ سکول زیب اخبار بنتے ہیں بھی تو اس وقت جب کوئی اعلیٰ عہدیدار یا سیاسی اہلکار ان کے بارے میں بات کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سرکاری سروے گھوسٹ سکولوں کا اتنو سامنے لے کر آتے ہیں تو بڑی بڑی اخباری سرخیاں بنتی ہیں مگر جونہی سروے کو کچھ روز گزرتے ہیں یہی سرخیاں چھوٹی ہوتے ہوتے اندرونی صفحات پر منتقل ہو جاتی ہیں اور کچھ عرصہ اور گزرنے کے بعد اشتہاروں سے مزین اخباری صفحوں میں محض فلر بن کر رہ جاتی ہیں۔

کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کوئی اخبار نویس چھلک اعداد وشمار سے کچھ ایسی جیتی جاگتی کہانیاں نکال کر لے آئے جو ہمدردوں کو انسانی دشواریوں کی صورت میں کچھ اس طرح سے دکھا سکیں کہ وہ ارباب اقتدار اور ہر کہ ومہ کو کچھ کرنے پر ابھار سکیں۔ کسی ایک گھوسٹ سکول کی داستان کو سرکاری سروے کے ملبے تلے سے نکال کر اخبار کے صفحۂ اول کی زینت بنانا یقیناً وہ واحد مگر ضروری عمل ہے جس کا حتمی اور منطقی نتیجہ اسکی بحالی اور فعالیت کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ مگر بس کہ دشوار ہے ہر مشکل کا آسان ہونا حتیٰ کہ وہاں بھی جہاں مشکل کا حل محض توجہ اور تھوڑی سی جرأت کا طالب ہوتا ہے۔

سیاستدانوں کے بیانات سے بھرے اخبارات، دہشت گردی مہنگائی اور جرائم کے بارے میں تو بہت چیختے چلاتے اور دھاڑتے ہیں مگر کئی سماجی مسائل جو اپنی ہمہ گیریت میں شاید کہیں زیادہ اور فوری توجہ کے طالب ہوں شاذ ہی بڑی سرخیاں بن پاتے ہیں۔ تعلیم اور صحت عامہ کے شعبے محض دو واضح ترین مثالیں ہیں جو اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں کرتے ہیں کہ ہمارے اخبار اور ہمارے اخبار نویس کی ترجیحات شاید وہ نہیں جو ہونی چاہئے۔

ایک اور حوالے سے دیکھا جائے تو اس رجحان کی وجہ شاید بھاری بھرکم الفاظ اور چھلک اعداد وشمار ہیں جو مسائل کا انسانی چہرہ یوں ڈھانپ لیتے ہیں کہ اخباروں کو سنسنی خیزی اور ہیجان انگیزی جیسے عوامل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی محض اس لئے کہ افسر شاہی اور حکومت کی بودی توجیہات اور کار زار سیاست اور حکومت کی الجھی موشگافیوں کے پیچھے چھپی پالیسیوں اور احکام کے حقیقی اور کبھی کبھی بھیانک نتائج کو سامنے لایا جا سکے۔

ایک بہتر طریقہ جو اخبارات اس دشواری کو عبور کرنے کیلئے استعمال کر سکتے ہیں وہ تحقیق اور تفتیش کا ہے مگر شاذ ہی آج کا کوئی اخبار یا اخبار نویس آمادہ عمل نظر آتا ہے کہ وہ بیان کے پیچھے چھپی خبر اور اعداد کے اندر مضمر انسانی المیوں کو اجاگر کرنے کی ہمت کرے۔ جہاں کہیں تحقیق اور تفتیش استعمال بھی ہوتے ہیں وہاں ان کا معیار اتنا پست ہوتا ہے کہ

> **سماجی مسائل جو اپنی ہمہ گیریت میں شاید کہیں زیادہ اور فوری توجہ کے طالب ہوں شاذ ہی بڑی سرخیاں بن پاتے ہیں**

ان کا مقصد تنقید برائے اصلاح کی بجائے تنقیص برائے کردار کشی بن کے رہ جاتا ہے۔ وہ توازن جو خبر نویسی اور الزام تراشی کے درمیان ایک واضح فرق کو سمجھنے اور برقرار رکھنے سے پیدا ہو سکتا ہے ہمارے اخبارات میں اکثر و بیشتر مفقود ہے۔

اس توازن کی عدم موجودگی کا سب سے بڑا نقصان شاید اس وقت ہوتا ہے جب اس کا اطلاق ایسی خبروں اور ایسے معاملات پر بے دریغ کیا جاتا ہے جن کا تعلق براہ راست کروڑوں لوگوں کی زندگیوں، سیاسی میلانات اور معاشی مفادات سے ہوتا ہے۔ اخبارات اور اخبار نویس حضرات کا سیاسی لڑائیوں، محلاتی سازشوں اور اقتدار کی پر پیچ غلام گردشوں کے پر پیچ تر رازوں کو انفرادی گروہی اور جماعتی مفادات کی خاطر کبھی کھولنے اور کبھی چھپانے میں بلا جھجک اور بلا خوف تقریر شامل ہونا ہمارے صحافتی ماضی اور حال کا وہ فسانہ ہے جو شاید کبھی نہیں لکھا گیا، مگر پھر بھی ہر کس و ناکس کو معلوم ہے۔

اس عدم توازن اور زر باری اور بادشاہ گر بننے کے رجحان کو مزید شہ احتساب تحریر اور پاداش کے مؤثر نظام کی عدم موجودگی سے ملتی ہے۔ آج جھوٹی خبر اور جھوٹے الزام پر قانونی گرفت تو علامتاً موجود ہے مگر عملاً اس کا اطلاق شاید ہی کبھی ہوا ہے۔ اور وجہ اسکی یہ ہے کہ ارباب اختیار اور ارباب اخبار ایک ایسا منظم نظام ہی وجود میں نہیں لا سکے جو ایسے قوانین کو تفریق اور امتیاز کے بغیر روبہ عمل لا سکے۔ ایسے نظام کی عدم موجودگی میں بلیک میلنگ، حکومتی اور سیاسی عمل میں مداخلت اور فساد پسندی کے عوامل تقریباً سبھی اخبارات میں بلا جھجک دندناتے پھر رہے ہیں اور اپنے تنگ نظر انفرادی، گروہی، جماعتی اور فرقہ وارانہ نظریات اور خیالات کو خبر کی آڑ میں چھاپ کر اپنے پس پردہ مقاصد کے حصول میں کسی قسم کی پکڑ دھکڑ کے خوف سے مبرا سرگرداں ہیں۔

مگر جہاں اخباری شعبہ بیرونی نگرانی کو قبول کرنے سے ہچکچاتا ہے وہاں بہت سے تاریخی، سیاسی اور معاشی عوامل کی وجہ سے اخبارات کا اندرونی ادارتی اور احتسابی نظام بھی برائے گور ہے۔ آج کتنے اخبار ہیں جہاں مدیران اپنے اخبار مالکان یا خبر حضرات سے زیادہ مضبوط اور با اختیار ہیں اور کتنے جریدے اور صحیفے ایسے ہیں جہاں مدیر اپنے ماتحت رپورٹرز کی سرزنش کے اہل ہیں۔ یوں کئی مالکان اور ان کی تقلید میں متعدد رپورٹرز اپنے اخبارات اور مدیران دونوں سے کہیں بڑے ہو چکے ہیں شاید اس قدر بڑے کہ ان کے لکھے پر زبان و بیان اور حقیقت نگاری کے مروجہ اور مصدقہ ضوابط بھی لاگو نہیں ہو پاتے۔ وہ جو چاہتے ہیں لکھتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں لکھتے ہیں کیونکہ انکے آجران اور مدیران کو اتنی ہمت نہیں کہ وہ ان کی خبر کو اس وقت تک روک سکیں جب تک وہ جملہ صحافتی اقدار پر پورا نہ اترتی ہو۔

یوں جو اخبار ہم روزانہ خریدتے اور پڑھتے ہیں انکے اپنے بنیادی مقاصد یعنی معلومات کی فراہمی، شعور اور آگاہی کی تخلیق و ترویج اور تفریح سب الٹ پلٹ ہو جاتے ہیں۔ ایک عدم متوازن، غیر ذمہ دارانہ اور جانبدارانہ لفظی شعبدہ بازی کا مجموعہ جو اپنی اصلی حالت میں کئی بڑے بڑے مقاصد حاصل کر سکتا ہے یقیناً بہتر سلوک کا متقاضی ہے۔

کیا میڈیا عوام کیلئے محض افیون ہے؟

یوں لگتا ھے کہ آج کل کا نشریاتی میڈیا غلط دھارے میں جا پھنسا ھے

یہ مسائل پر مبنی سیاست کے مقابلے میں شخصیات کی سیاست کو نمایاں کرتا ھے

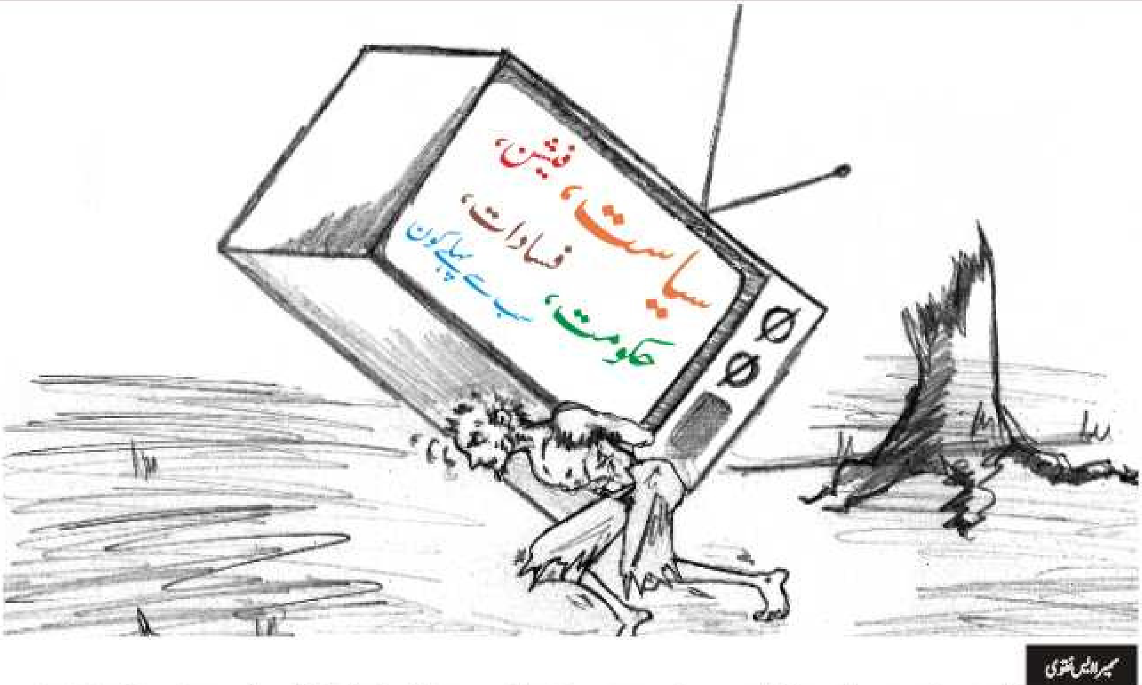

سمیر اویس نقوی

حال ہی میں ایک مقبول نیوز چینل نے رات کے دو بجے یہ اطلاع تازہ ترین خبر کے طور پر چلائی کہ لاہور میں جی ٹی روڈ پر ایک تیز رفتار ٹرک نے ایک گائے کو ٹکر مار دی۔ مقامی لوگ اور گائے کے مالکان سڑک پر جمع ہو گئے اور انہوں نے احتجاجاً سڑک بلاک کر دی۔ انہوں نے حکومت کے خلاف نعرے بازی کی اور اس پر الزام لگایا کہ اس نے سڑک کھود رکھی تھی جس کی وجہ سے ٹکر ہوئی۔ کچھ ہی دیر بعد سکرین پر چلنے والی خبر میں کہا گیا کہ مقامی لوگوں نے مری ہوئی گائے کو اٹھایا اور سڑک خالی کر دی۔

اگر کوئی شخص ایک اہم ٹی وی چینل پر سی این جی کی قیمتوں میں اضافے کے کھیلے کے مقابلے میں اس خبر کو چلائے جانے کے جواز کے بارے میں سوال اٹھاتا تو شائد پروڈیوسر یہ کہتا کہ یہ جانوروں کے حقوق کا معاملہ تھا اور اس پر عوامی حمایت کی ضرورت تھی۔ میڈیا کی غلط ترجیحات کا ذکر کرتے ہوئے شاید یہ بات مبالغے پر مبنی اور خبروں پر صوابدید کے سلسلے میں سطحی محسوس ہو مگر اس سے حاصل ہونے والے سبق مکمل طور پر غیر متعلقہ نہیں ہیں۔

یوں لگتا ہے کہ آج کل کا نشریاتی میڈیا غلط دھارے میں جا پھنسا ہے۔ یہ مسائل پر مبنی سیاست کے مقابلے میں شخصیات کی سیاست کو نمایاں کرتا ہے۔ انتخابات سے پہلے کوئی بھی سیاسی جماعتوں کے اصل منشوروں کے بارے میں سوال نہیں اٹھا رہا تھا۔ کیا میڈیا اپنے آپ کو اس مخمصے میں پھنسا محسوس کرتا ہے کہ کیا رپورٹ کیا جائے اور کیا نہیں؟ کیا نشر کی جانے والی کوئی خبر مثبت نتائج کی طرف لے جائے گی یا میڈیا نے اپنے ناظرین و سامعین کے سامنے اپنا اعتبار برقرار رکھنے کے لئے یہ سمجھوتا کر رکھا ہے؟ بلاشبہ جہاں تک ہمارے حقوق کا تعلق ہے ہم ایک مایوس قوم ہیں۔ میڈیا غالباً وہ واحد ذریعہ ہے جو لوگوں کو ایک بنیادی تبدیلی کی طرف لے جانے اور باخبر فیصلے کرنے کے قابل بنانے میں کردار ادا کر سکتا ہے۔ تاہم آج کل میڈیا کے کردار پر سب سے زیادہ سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ اس کے کمتر معیار کی طرف رجحان پر گہرے غور و خوض کی ضرورت ہے تاکہ مستقبل کے لئے بغیر کسی دباؤ کے ترجیحات کا تعین کیا جا سکے۔

اگرچہ گزشتہ برسوں میں پرائیویٹ نیوز ٹی وی چینلوں کی تعداد میں اضافے سے ظاہر ہوتا ہے کہ میڈیا نے خیالات اور آراء کی تشکیل کی ذمہ داری کو قابل تعریف انداز سے نبھایا، اب میڈیا کی صنعت کے اپنے اندر مفادات کا یہ تصادم ابھر آیا ہے کہ آزادی اور ذمہ داری کی اچھی اقدار پر کیسے عمل کیا جائے اور صحیح مسائل کو کیسے اجاگر کیا جائے۔ روایت سے ہٹ کر سوچنے کی کوشش میں بہت سے مسائل روایت کو توڑتے ہوئے قابو سے باہر ہو چکے ہیں اور عوامی ردعمل کے حوالے سے حدوں کو پھلانگ چکے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ نشریاتی میڈیا کو خود اپنی رپورٹوں کے ذریعے آگے بڑھنے نہیں دیا گیا۔ صحافیوں کو "طے شدہ آزادی" اور "متنازعہ حدود" کے درمیان نازک اور غیر واضح خطوط کے طور پر کام کرتے ہوئے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میڈیا کے لئے ظالمانہ قوانین اور پیمرا جیسے خوفناک ہتھکنڈوں کو کسی بھی چینل کے خلاف استعمال کیا جا سکتا تھا جو "حدود سے باہر" نکل رہا ہو اور اسے واپس سرکاری موقف کی حدود میں دھکیلا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر صدر پاکستان کے جہاز کی پرواز اور اترنے کی خبریں کوئی خاص دلچسپ نہیں ہوتیں۔ اس سے لوگوں کے گھروں میں پانی یا بجلی کی فراہمی کو یقینی بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ میڈیا غیر جانبدارانہ دلچسپی کا مظاہرہ کر کے حقیقی معنوں میں عام آدمی کی خدمت کر سکتا ہے۔ شخصیات کی تشہیر ترک کر کے، اہم سماجی مسائل کو اجاگر کر کے اور باقاعدگی سے ان کا فالو اپ کر کے خود اپنی ایک تحریک بنا سکتا ہے۔

پاکستان جیسے بنیادی طور پر قدامت پسند معاشرے میں سچ کو افشا کرنا بذات خود صحافیوں کے لئے اور خصوصاً نشریاتی صحافیوں کے لئے ایک چیلنج رہا ہے۔ ہم سچ سننا نہیں چاہتے اور نہ ہی ہم جائزے پسند کرتے ہیں، ہم صرف اپنی آزادی طرح کی معافی چاہتے ہیں۔ کوئی بھی یہ اعتراف نہیں کرنا چاہتا کہ اس نے غلطیاں کیں۔ تاہم ناتجربہ کار رپورٹروں کی طرف سے حقائق کی توڑ مروڑ اور خبروں کو حد سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی وجہ سے لوگوں میں یہ تاثر بڑھا ہے کہ سچ کی تشہیر کے سلسلے میں میڈیا غیر ذمہ دارانہ کردار ادا کر رہا ہے۔

نشریاتی میڈیا نے آج کل وہی راستہ اختیار کر رکھا ہے اور وہی راگ الاپ رہا ہے جو سیاسی جماعتوں کا ہے۔ ٹی وی کی خبروں کا مرکز سیاسی کشمکش ہے، سیاسی لیڈروں کے بے کار بیانات کی خبریں چلا کر اور انہیں شہ سرخیاں بنا کر ان کی سرپرستی کی جاتی ہے۔ میڈیا کے ماہرین کہتے ہیں کہ ایک مضبوط سیاسی سیٹ اپ کے بغیر کچھ بھی نہیں چل سکتا لیکن پاکستان میں یہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والی طاقت کی کشمکش دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ لوگوں کی امیدیں بے لچک اسٹیبلشمنٹ کی دیوار سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکی ہیں۔

اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا اپنے کردار کا نئے سرے سے تعین کرے۔ گرتی ہوئی معیشت، پانی کی قلت، خوفناک لوڈ شیڈنگ جیسے مسائل نشریاتی میڈیا پر کبھی کبھار ہی جگہ پاتے ہیں۔ ان کے بارے میں فالو اپ رپورٹیں اس انداز سے دی جانی چاہئیں کہ لوگوں کی شکایات کا کسی حد تک ازالہ ہو سکے۔ جیسے سڑک کے بیچ میں کھلی ہوئی گٹر لائن ہر روز دکھائی جا سکتی ہے اور بلدیاتی حکومت کے نمائندوں سے ہر دوسرے دن انٹرویو کیا جا سکتا ہے۔

اس بات سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے ملک کی پیچیدہ سیاسی تاریخ کی وجہ سے لوگوں میں پھلتی پھولتی جمہوری حکمرانی کی سمجھ پیدا نہیں ہو سکی۔ لوگ جھوٹے وعدوں اور ٹوٹی امیدوں سے ناخوش ہیں۔ براہ راست لمحہ بہ لمحہ رپورٹنگ کی طاقت شخصیات کی بجائے مسائل پر توجہ دے کر اور غیر جانبدارانہ اور موثر کردار کے ذریعے عام آدمی کی امیدیں واپس دلائی جا سکتی ہیں۔ لوگوں میں یہ سوچ پیدا ہونے دی جائے کہ میڈیا محض مخصوص مفادات کے لئے کام کرتا ہے اور عوام کے لئے محض افیون ہے۔

(بشکریہ روزنامہ ڈان)

آزاد میڈیا شکایت کمیشن کے قیام کا اعلان

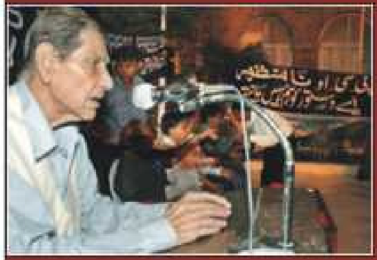

یہ بات خوش آئند ہے کہ پاکستان کے صحافیوں نے ملک میں صحافت کے گرتے ہوئے معیار کو سنبھالا دینے کیلئے لائحہ عمل کا اعلان کیا ہے۔ یہ اعلان اگست کے پہلے ہفتے میں لاہور میں منعقدہ پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس اور انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس (آئی ایف جے) کی ایک مشترکہ کانفرنس کے بعد کیا گیا۔ روزنامہ ڈان کی ایک رپورٹ کے مطابق آئی ایف جے نے اس اعلامیہ کو پاکستان میں صحافت کیلئے ''بریک تھرو'' قرار دیا ہے۔ کانفرنس میں پاکستان بھر سے 120 سے زائد صحافیوں نے شرکت کی اور قومی صحافیانہ ضابطہ اخلاق تشکیل دینے، میڈیا کے بارے میں شکایات کے ازالے کیلئے آزاد کمیشن قائم کرنے اور اس امر کو یقینی بنانے کے ایک پروگرام کی منظوری دی کہ ملک بھر میں اخبار نویس طویل مدت سے کھٹائی میں پڑے ساتویں ویج ایوارڈ کے مطابق تنخواہیں حاصل کر سکیں۔ رپورٹ کے مطابق کانفرنس میں شریک اخباری مالکان اور ایڈیٹروں نے تنخواہوں میں فوری اضافے پر عملدرآمد پر آمادگی ظاہر کی اور پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق اور پاکستانی میڈیا کی سماعت کمیشن کے پروگرام کی توثیق کی۔

اخبار نویسوں کی کانفرنس نے ایک 28 نکاتی ضابطہ اخلاق کے مسودے کی منظوری بھی دی۔ علاوہ ازیں ایک ایسے پروگرام کی منظوری دی جس کے تحت میڈیا کے بارے میں شکایات کے ازالے کیلئے آزاد کمیشن قائم کیا جائے گا جو اخباری مالکان، ایڈیٹرز اور براڈ کاسٹرز کی ایسوسی ایشن کے مشورے سے قائم ہوگا۔

پی ایف یو جے کے صدر [illegible] کی قیادت میں ایک کمیٹی مجوزہ کمیشن کی ساخت اور اس کے دائرہ کار کے بارے میں مسودہ تیار کرے گی۔ کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز کے صدر عارف نظامی نے پی ایف یو جے اور آئی ایف جے کے ان اقدامات کی حمایت کی اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلایا۔ انہوں نے کہا کہ سی پی این ای کے اجلاس میں ان معاملات کو زیر بحث لائیں گے۔ روزنامہ فرنٹیئر پوسٹ کے ایڈیٹر انچیف رحمت شاہ آفریدی نے بھی صحافیوں اور اخباری کارکنوں کیلئے ساتویں ویج ایوارڈ پر عملدرآمد کا اعلان کیا۔ آئی ایف جے کے جنرل سیکرٹری ایڈن وائٹ نے کانفرنس کو پاکستان میں صحافت کیلئے سنگ میل قرار دیا۔

میڈیا کن کے لئے ہے !!!

ارشد رضوی

ذرائع ابلاغ اپنے ناظرین وقارئین کو حالات حاضرہ سے باخبر رکھنے کو اپنا بنیادی مقصد گردانتے ہیں۔ ہمارے اردگرد اور دنیا بھر میں کیا کچھ ہورہا ہے اس کے بارے میں ہماری معلومات کا ایک بڑا ذریعہ میڈیا (پرنٹ اور الیکٹرانک) ہی ہے۔ معاشیات، سیاسیات، سماجیات، ماحولیات، سپورٹس، فیشن غرضیکہ ہمارے اپنے ملک اور دنیا بھر میں جو کچھ بھی ہورہا ہے ہمیں اس کے بارے میں میڈیا ہی کے ذریعے علم ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو بلاشبہ میڈیا معلومات، علم وآگہی اور تفریح مہیا کرنے کا بڑا کام سرانجام دے رہا ہے۔

میڈیا' جو مذکورہ ذمہ داری ادا کرتا ہے اس کے بنیادی مخاطب، ناظر اور قاری 'لوگ' یا عوام ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کو 'مخاطب' کرتے ہوئے اخبارات ورسائل اور ٹی وی چینلز آج کے دور کا غالباً سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار چلا رہے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹی وی چینل پر خبریں نشر ہورہی ہوں، ٹی وی ٹاک شو چل رہا ہو، سپورٹس کا پروگرام دکھایا جارہا ہو یا ڈرامہ، اشتہارات کی بھرمار ہے جو کسی بھی پروگرام کو ایک تسلسل سے اپنے ناظرین تک نہیں پہنچنے دیتی۔ یہی صورت حال اخبارات کی ہے۔ اخبار کا پہلا صفحہ (front page) گویا ہے ہی اشتہارات کیلئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میڈیا کی کمائی اور منافع کا بنیادی ذریعہ 'لوگ' ہیں جنکو اشتہارات دکھانے سے میڈیا پر دھن برس رہا ہے۔

جب میڈیا کے بنیادی مخاطب لوگ ہیں تو پھر منطقی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میڈیا کو انہی لوگوں کے سامنے 'جواب دہ' بھی ہونا چاہیے، یعنی میڈیا کے محتسب یہ لوگ ہیں۔ کیا واقعی ایسا ہے؟ کیا میڈیا عملاً لوگوں کے سامنے جواب دہ ہے؟ کیا میڈیا لوگوں کو وہ دکھا اور بتا رہا ہے جس کا جاننا لوگوں کا حق ہے؟

عموماً ہمارے اخبارات میں نمایاں خبروں اور ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز کا موضوع سیاست ہی ہے۔ ٹاک شوز میں 'ماہرین' کی آراء کے ساتھ ساتھ اینکر پرسن اپنی قیمتی آراء بھی ضرور دیتے ہیں یا پھر مہمان کی بات کو وہ رُخ دینے کی بھرپور سعی کررہے ہوتے ہیں جو ان کے چینل کی 'پالیسی' ہوتی ہے۔ اسی طرح اخبارات کی شہ سرخیوں کیلئے پسندیدہ افراد میں صدر پاکستان، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ اور وزیر ہیں۔ اس کے بعد اگر جگہ بچ جائے تو کرائم وجرائم اخبارات کے لئے دلچسپ 'لیڈ' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ کیوں کبھی نہیں ہوتا کہ اخبارات وٹی وی چینلز وہ بھی دکھائیں جو حقیقتاً لوگوں کو درپیش ہے۔ مثال کے طور پر مہنگائی کا عفریت جس نے غریب کا تو ذکر ہی کیا چنگے بھلے سفید پوشوں کے ہوش اڑا دیے ہیں، اس کے علل واسباب پر کوئی ٹاک شو، جس کے شرکاء میں ماہرین کے علاوہ عام فرد جس کا اس مہنگائی سے بلاواسطہ اور گہرا تعلق ہے، دکھایا جائے، کوئی تحقیقی سروے کہ کیسے پانچ افراد کی ایک فیملی دس پندرہ ہزار روپے ماہانہ آمدن سے گذر بسر کرتی ہے، اور ایک اردلی، ایک چوکیدار، ایک سیلز مین، ایک ٹھیلے والا، گھروں میں کام کرنے والی اپنے گھر کی واحد کفیل، پرائمری ٹیچر، کلرک اور آفس بوائے یہ سب کس طرح گذر بسر کرتے ہیں۔ مہنگائی کی مصنوعی وجوہات جس کے پیچھے صرف ناجائز منافع خوری کا عنصر کارفرما ہے اسے قابو کرنے کی حکمت عملی یہ عام لوگ کیا بتاتے ہیں۔ شہروں کی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں اور ان سڑکوں پر بہتا گٹروں کا پانی، کون ہے اس کا ذمہ دار؟ کبھی ہمارے میڈیا نے اس بارے اپنے 'محتسبوں' کو زحمت دی کہ وہ کسی ٹاک شو میں ایسے مسائل پر خامہ فرسائی اور اس جن کو بوتل میں بند کرنے کی حکمت عملی پر بات چیت کریں۔

دنیا بھر میں میڈیا کے رول پر تنقیدی آوازیں شدت کے ساتھ اٹھتی سُنی جاسکتی ہیں اور پاکستان میں بھی اس کی ضرورت کو کم از کم پیشہ ور صحافیوں نے محسوس کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہمارا میڈیا اپنا قبلہ درست کرنے کے بارے اپنے 'محتسبوں' کے جذبات و احساسات، محرومیوں، ضرورتوں اور انسانی خواہشوں کا احترام کرنے کی طرف مائل بہ کرم ہوجائے۔

انٹرنیشنل یونین فار فوڈ ورکرز (IUF) کا وزیر اعظم پاکستان اور وزیر محنت کے نام کھلا خط

جسے پاکستان کے اخبارات نے شائع کرنے سے انکار کر دیا

یکم مئی 2008 کو انٹرنیشنل یونین فار فوڈ ورکرز (IUF) جس کا صدر دفتر جنیوا، سوئٹزرلینڈ میں ہے، وزیر اعظم اور وزیر محنت و افرادی قوت کے نام ایک کھلا خط پاکستانی اخبارات میں شائع کروانا چاہتی تھی، جس میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی کی ٹریڈ یونین کے حقوق سے مسلسل انکار کا ذکر تھا۔ پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی، پاکستان میں موجود بڑے ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ آئی یو ایف نے اس خط کو اخبارات میں بطور اشتہار بھی چھپوانا چاہا جس کیلئے اخبار کو ادائیگی کی جاتی مگر تمام اخبارات نے جن سے آئی یو ایف نے رابطہ کیا، اسے شائع کرنے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی گئی۔ آئی یو ایف نے اس خط کو اخبارات میں بھیجنے سے قبل اس کے متن کے قانونی پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا اور قانونی ماہرین کے مطابق یہ خط ہر طرح سے اخبارات میں قابل اشاعت تھا۔

آئی یو ایف نے یہ خط حکومت پاکستان کے نمائندوں کو بھیجا اور یکم مئی کو ڈی ٹی وی پر آئی یو ایف کا پیغام بھی نشر ہوا۔ ذیل میں اس خط کا مکمل متن درج ہے جو پاکستانی اخبارات کیلئے ''ناقابل اشاعت'' تھا:

ناقابل اشاعت

30 اپریل 2008

محترم جناب یوسف رضا گیلانی صاحب
وزیر اعظم پاکستان

محترم جناب خورشید شاہ صاحب
وزیر محنت، افرادی قوت اور بیرون ملک پاکستانیز

جناب عالی! ہم ممبران انٹرنیشنل یونین برائے فوڈ ورکرز (ایک عالمی ٹریڈ یونین فیڈریشن جو پاکستان سمیت ایک کروڑ دس لاکھ سے زائد افراد کی نمائندہ ہے) پاکستان میں نئی جمہوری حکومت کی تشکیل پر آپکو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ حالیہ الیکشن اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ پاکستانی عوام عدل، امن، رفاع اور حقوق کی پاسداری کرنے والی حکومت کے متلاشی ہیں۔ ہم آپ کے اقدامات کا خیر مقدم کرتے ہیں کہ آپ نے مزدوروں کے خلاف قوانین ختم کرنے اور مزدوروں کی تنخواہوں میں اضافے کے احکامات جاری کئے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان احکامات پر تندہی سے عمل درآمد بھی کیا جائے گا۔

اس موقع پر میں آپکی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں جو پاکستان میں بنیادی انسانی اور مزدوروں کے حقوق مسلسل سلب کئے ہوئے ہے۔ کراچی پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کے محنت کش جن کا الحاق آئی یو ایف کیساتھ ہے اور پاکستان ہوٹل ورکرز فیڈریشن کے ممبر ہیں، 2001 سے پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی میں کام کرنے والے افراد اپنی یونین اور حقوق کیلئے مسلسل انتظامیہ سے رابطے میں ہیں۔ گذشتہ 6 سال سے ہاشو گروپ اور انتظامیہ اس جمہوری یونین کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہے ہیں اور اکثر مختلف انداز میں ہماری یونین اور اس کے اراکین کو ہراساں بھی کیا جاتا ہے۔

2001 میں تقریباً تین سو کنٹریکٹ مزدوروں کو فارغ کر دیا گیا جس کی بنیادی وجہ ان کا اپنے حقوق کیلئے سرگرم رہنا تھا۔ اگر مزدوروں کو ملازمت سے نکالا جانا ضروری ہو تب بھی قانونی تقاضوں کے مطابق انہیں بتایا جانا ضروری ہوتا ہے جب کہ انتظامیہ نے ایسا بھی نہیں کیا۔ یونین کے رہنماؤں نے قانون کے تحت ان مزدوروں کی ملازمت پر بحالی کی بات کی تو ان کو زدوکوب کیا گیا اور غلط الزامات لگا کر جیل بھیج دیا گیا۔ اپنے حقوق کے دفاع کی جدوجہد کے جرم میں ان مزدوروں کو اپنے روزگار سے ہاتھ دھونے پڑے، بچوں کو سکول سے اٹھانا پڑا اور ان کے خاندان تباہ و بے حال ہو گئے۔

صنعتی تعلقات سے متعلق مسائل میں یہ مسئلہ پاکستان کا طویل ترین مسئلہ بن چکا ہے۔ کیا آپ کی حکومت بھی ان مزدوروں کو انصاف کی فراہمی میں ناکام ہونا چاہے گی؟ پاکستان کے مزدوروں کی نظر میں کیا یہ حکومت بھی پرانی حکومت کی طرح ہوگی جو طاقتور کو قانون سے بالاتر کرے اور پاکستانی محنت کش بے بسی و انکساری کے ساتھ یہ سب کچھ برداشت کرتے رہیں!

آپکی حکومت کے پاس یہ ایک بے مثال موقع ہے کہ آپ پاکستان کے تمام شہریوں کو ایک نئے پاکستان سے متعارف کروائیں جہاں عدل و مساوات اور حقوق کی پاسداری کی جاتی ہو۔ ٹریڈ یونین کے حقوق کی بحالی سے آپ کی حکومت کے فیصلہ کن اقدامات کو مزید تقویت ملے گی کہ پاکستانی عوام نے اپنے حق رائے دہی کے دانشمندانہ استعمال سے ایک ایسی حکومت تشکیل دی ہے جہاں طاقتور اور دولت مند کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔

میں آئی یو ایف کے تمام ممبران، جو پاکستان میں ہیں اور بیرون ملک بھی، سب کی جانب سے آپ کی حکومت کو پیغام دینا چاہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد پرل کانٹی نینٹل ہوٹل کراچی کے مالک اور انتظامیہ کو بات چیت پر آمادہ کریں اور صنعتی تعلقات کو بحال کرنے کی کوشش کریں تاکہ مزدوروں کے روزگار کو مزید متاثر نہ کیا جا سکے اور پاکستانی ہوٹل اور سیاحت کو نقصان سے بچایا جا سکے۔

رون آسولڈ
آئی یو ایف سیکرٹری جنیوا، سوئٹزرلینڈ

وزیراعظم کا دورہ امریکہ اور پاکستانی میڈیا

وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی نے چند ہفتے قبل امریکہ کا دورہ کیا۔اس دورے سے قبل ہی اس کی اہمیت کے بارے میں بحثوں کا آغاز ہو گیا تھا۔دورے کے بعد سے کم و بیش ہر شخص جس کا ذرائع ابلاغ سے تعلق ہے وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کو دورہ امریکہ کے دوران سوالوں کے غیر واضح جوابات دینے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔وزیراعظم کو اس لئے بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ انہوں نے امریکیوں کو پاکستانیوں کے جذبات سے آگاہ نہیں کیا ہے۔اس حقیقت سے ہر کوئی آگاہ ہے کہ آج کل پاکستانیوں کے جذبات کیا ہیں۔اگر وزیراعظم یا کوئی اور اعلیٰ حکومتی عہدیدار بیرونی دنیا کو عوام کے جذبات سے آگاہ کرنے کی غلطی کر بیٹھے تو پاکستان کے دنیا میں تنہا رہ جانے کا خدشہ ہے۔نجی ٹیلی ویژن کے کچھ میزبان جنہیں ریاستی امور کا ذرا بھی ادراک نہیں، عام لوگوں کا ذہن لے کر جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کر رہے ہیں۔حکومتوں کے سربراہان بیرونی دوروں پر جاتے ہیں تو ان کے دورے سفارتی عمل کا حصہ ہوتے ہیں۔کوئی بھی سنجیدہ حکمران غیر ملکی دورے پر جارحانہ انداز نہیں اپناتا اس لئے کہ اس کی اولین ترجیح ریاست کا تحفظ ہوتی ہے۔دوسرے الفاظ میں کسی بھی ملک کے سربراہ کے اس طرح کے دوروں کا مقصد میزبان ملک کو چیلنج کرنا نہیں ہوتا بلکہ تعلقات میں بہتری لانا ہوتا ہے تا کہ وطن اور اہل وطن کی مشکلات میں کمی واقع ہو،ملک میں عوام کے لئے روزگار کے مواقع پیدا ہوں،بیرونی دنیا سے سرمایہ کاری حاصل ہو اور ملک معاشی ترقی کی راہ پر گامزن ہو۔اگر کسی کو چیلنج کرنا مقصود ہو تو اپنے ہی ملک میں ٹھہرنا کافی ہوتا ہے۔جب آپ کسی کو چیلنج کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ تنہائی ہی نکلتا ہے۔دنیا آپ کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔چیلنج کرنے والی ریاست کو اپنی ضروریات پوری کرنے خاص طور پر معیشت کو استوار کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔کسی بھی حکومت کے پاس دو رستے ہوتے ہیں۔ایک رستے پر چل کر وہ اختلافات کو کم کر سکتی ہے تو دوسرے رستے پر چلتے ہوئے وہ خلیج میں اضافہ کر سکتی ہے۔ان دونوں میں سے ریاست کون سا رستہ اپناتی ہے اس کا انحصار وہاں قائم حکومت پر ہوتا ہے۔وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کے دورہ امریکہ کو اس وجہ سے بھی تنقید کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ وہاں اچھی انگریزی نہیں بول سکے۔پاکستان میں امیر طبقے کی تقریبات میں ان دنوں وزیراعظم کے امریکی تھنک ٹینک میں مکالمے کے دوران انداز گفتگو کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔اس طبقے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وزیراعظم مشکل سوالات کو سمجھ ہی نہیں سکے۔ان کی لکھی ہوئی تقریر بالکل واضح تھی تاہم وزیراعظم سوالات کے واضح جوابات نہیں دے سکے۔ہمارے یہاں بہت سے لوگ چاہتے ہیں کہ وزیراعظم "دلیری" کے ساتھ بات کریں۔امریکہ میں مقیم کچھ پاکستانیوں کی بھی خواہش تھی کہ وہ پاکستان کے "وقار" کو بحال کریں۔آج ہماری معیشت زبوں حالی کا شکار ہے اور ماہرین معاشیات کے مطابق بیرونی امداد کے بغیر اسے بہتر بنانا ممکن نہیں رہا۔

> کچھ مشہور کالم نگاروں کا خیال ہے کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو اندرون ملک اپنی سیاسی حیثیت مستحکم ہونے تک امریکہ کے دورے پر نہیں جانا چاہیے تھا۔

دوسری طرف کچھ مشہور کالم نگاروں کا خیال ہے کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی کو اندرون ملک اپنی سیاسی حیثیت مستحکم ہونے تک امریکہ کے دورے پر نہیں جانا چاہیے تھا۔ان کے خیال کے مطابق سید یوسف رضا گیلانی کو بطور وزیراعظم مزید تربیت کی ضرورت ہے۔حقیقت یہ ہے کہ وزرائے اعظم اس چیز کا انتظار نہیں کر سکتے کہ ان کی تربیت مکمل ہو اور پھر وہ دنیا سے بات کریں۔وہ بحرانوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیرونی دورے کرتے ہیں۔ان کی کوشش ہوتی ہے کہ مختلف ممالک کے دورے کر کے ملک کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔چنانچہ کامیابی کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ کسی رہنما کے جارحانہ رویے کی وجہ سے کتنے لوگ مطمئن ہوئے بلکہ اصل پیمانہ یہ ہے کہ ڈپلومیسی کے ذریعے کس حد تک ملکی مفادات کا دفاع کیا گیا۔اصل مسئلہ کسی تھنک ٹینک کو مطمئن کرنا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ کیا مراعات حاصل کی گئیں۔ایک کالم نگار وزیراعظم کے دورہ امریکہ کے بارے میں لکھتا ہے:"وزیراعظم سید یوسف رضا گیلانی کے حمایتی اور ان کا سٹاف یقیناً وزیراعظم کے دورہ امریکہ کو کامیاب قرار دیں گے کیونکہ یہ ان کا کام ہے۔خاص طور پر وزیراعظم کے حمایتی یہ کہیں گے چونکہ پاکستان کو مشروط مالی امداد فراہم کرنے کا وعدہ کیا گیا ہے اس لئے یہ دورہ کامیاب رہا،لیکن ان کے دورہ امریکہ کا بغور جائزہ لینے والے تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ وزیراعظم کو پہلے اپنی پوزیشن مستحکم کرنی چاہیے تھی اس کے بعد وہ امریکہ کا دورہ کرتے۔وہ ابھی بالکل نئے ہیں اور پوری طرح سے اپنی پارٹی کے شریک چیئرمین اور مشیروں کے اثر سے آزاد نہیں ہوئے۔"یہ سوال کیا جا رہا ہے کہ اس امداد کا کیا فائدہ جسے پاکستان آزادی سے استعمال میں نہیں لا سکتا۔سوال یہ ہے کہ پاکستان بیرونی امداد کے بغیر کیسے اپنی معیشت کو بہتر بنا سکتا ہے۔اگر ہم اپنے ملک کی اقتصادیات کا دیانتداری سے جائزہ لیں تو احساس ہوتا ہے کہ بدقسمتی سے پاکستان میں معیشت کی جانب وہ توجہ نہیں دی گئی ہے جو دینی چاہیے تھی۔معیشت کو بہتر بنانے کیلئے امن کا قیام اشد ضروری ہوتا ہے۔جنگ ایسا اقدام ہے جس سے وقار اور جذبات کو تو مطمئن کیا جا سکتا ہے لیکن معیشت بہتر نہیں بنائی جا سکتی۔کہا جاتا ہے کہ وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اپنے دورے پر متاثر کن گفتگو پر قادر نہیں تھے تو شاید کچھ لوگوں کو یاد ہو کہ بھارتی وزیراعظم شاستری تاشقند میں ہمارے پُراعتماد جنرل ایوب خان کے مقابلے میں بہت کم گو تھے۔اسی طرح سابق وزیراعظم محمد خان جونیجو جن کو عام طور پر بہترین سربراہ حکومت کے طور پر یاد کیا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے صدر ضیاء الحق کی خواہش کے برعکس جنیوا معاہدے پر دستخط کر دیے تھے،صدر ضیاء الحق کا اس ضمن میں مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔حقیقت یہ ہے کہ ڈیورنڈ لائن کے دونوں اطراف جاری سرگرمیوں کی بناء پر اس دورے کی اشد ضرورت تھی۔وزیراعظم کے اس بیان کو سامنے رکھنا چاہیے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ نائن الیون جیسا واقعہ دوبارہ ہو سکتا ہے اور اس دفعہ اس کی منصوبہ بندی پاکستانی علاقے میں ہونے کا امکان ہے۔ان کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے اور اس کی

> امریکہ میں مقیم کچھ پاکستانیوں کی بھی خواہش تھی کہ وہ پاکستان کے "وقار" کو بحال کریں۔

صداقت کا اندازہ قبائلی علاقوں کی موجودہ حالت سے لگایا جا سکتا ہے لہٰذا ان حالات میں ضروری ہو گیا تھا کہ عالمی برادری بالخصوص امریکہ کو اعتماد میں لیا جائے۔

(اداریہ روزنامہ "آج کل" لاہور)

انٹرنیٹ: ہر مال ملے گا....

خالد حسن

شاید کہ پاکستان میں سیاسی شور شرابا اتنا نہ ہو جتنا کہ انٹرنیٹ پر نظر آتا ہے اور یہ بات حیران کن ہے۔ کیا بعض لوگوں کے پاس اس بارے میں اظہار خیال کرنے سے بہتر کوئی اور کام نہیں کہ پاکستان میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا۔

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ یہ خیالات پر لطف بھی ہوں۔ لیکن جب انہیں پر لطف بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ خیالات اور بدمزہ ہو جاتے ہیں۔ ابھی کچھ دن پہلے قومی ترانہ کی پیروڈی گردش میں تھی۔ میں نے صرف دو مصرعوں کے بعد مزید پڑھنا چھوڑ دیا کیونکہ وہ تو وزن میں بھی نہیں تھے۔ گو کہ ہمارے قومی ترانہ میں اردو کے صرف تین یا چار الفاظ ہی ہیں مگر یہ وزن میں ہے۔

انٹرنیٹ پر بہت عجیب و غریب کریکٹر پائے جاتے ہیں ان میں سے ایک صاحب شاید بوسٹن کے آس پاس کہیں رہتے ہیں اور خود کو کبھی بین الاقوامی پروفیسر کہلواتے ہیں اور کبھی کسی اور نام سے نظر آتے ہیں۔ یہ صاحب ہمیشہ امریکہ اور لبرل ازم کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں یا پھر القاعدہ سے اپنی محبت کا اظہار۔ وہ سیاستدانوں اور صحافیوں پر تشدد و تیز حملوں کے دلدادہ ہیں۔ ان کی تحریریں لوگوں کو تشدد پر اکساتی ہیں جو امریکہ میں جرم ہے اور شاید ہوم لینڈ سیکورٹی اس بارے میں کچھ کر سکے۔ کچھ لوگوں نے ان حضرت سے کہا کہ اگر وہ اپنی باتوں میں سچے ہیں تو اپنی اصل شناخت کرائیں مگر یہ صاحب بزدل نکلے۔ یہ جو کوئی بھی ہے، بہت ہی خطرناک شخص ہے۔

اب ایک اور صاحب ہیں شفیق خان جو اپنے آپ کو پاکستانی سیاست اور سیاستدانوں کا ماہر سمجھتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جس قسم کا یہ گند اچھالتے ہیں تو یہ انکا فرضی نام ہے۔ میں نے لسٹ سے اپنا نام نکالنے کو کہا۔ اب میں نے انکا ای میل ایڈریس اپنی بلاک لسٹ میں ڈال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت سے لوگ ہونگے جنہوں نے میری طرح ایسے ہی کیا ہوگا۔

ایک اور بڑا اوارس ایک خاتون ہیں جو لاہور سے ہیں یا اپنے آپ کو لاہور کا ظاہر کرتیں ہیں اور اپنا نام یاسمین علی لکھتی ہیں۔ اگر کہیں پر بھی مقابلہ مس ناسٹی (Miss Nasty) ہو تو وہ بغیر کسی مشکل کے پہلے نمبر پر ہوں گی۔ یہ سچ ہے کہ ان کی انگلش بہت اچھی ہے مگر وہ جو لکھتی ہیں اسے کھانے کے بعد نہیں پڑھنا چاہیے کیونکہ ایسے میں قے کا احتمال ہوتا ہے۔

ایک سید جمال الدین صاحب بھی ہیں جو فرانس میں ہیں۔ یہ صاحب تو پاکستان کو توڑنے کے درپے ہیں یہاں تک کہ ان کے چند ای میل ایڈریس میں سے ایک کا تو نام بھی divide-pakistan.com ہے۔ یہ صاحب کون ہیں اور کس کے لئے کام کرتے ہیں یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں، اسی لئے میں اس مسئلہ کو یہیں چھوڑتا ہوں۔

پھر اور لوگ بھی ہیں۔ مجھے کچھ دن پہلے ایک ای میل ملی جس میں لکھا تھا۔ جنرل اشفاق پرویز کیانی اپنی ایک تقریر تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ جلد ہی عوام سے خطاب کریں گے اور ان کے شروع کے جملے ہوں گے "میرے عزیز ہموطنو"۔

ایک بھارتی جو لندن سے ای میل کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پاکستان کو مشورہ دیتے رہتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں کہ پاکستان اور انڈیا کا کوئی مقابلہ نہیں اور پاکستان کو یہ تسلیم کرتے ہوئے اپنے آپ کو کمتر سمجھنا چاہئے اور بہت اونچا نہیں اڑنا چاہئے جیسے کہ وہ اڑتا ہے۔

ایک اور ای میلر ہیں جو اپنے آپ کو جی بسواس کہتے ہیں۔ یہ اسلام سے نفرت کرتے ہیں میرا خیال ہے انکو ملا عمر کے حوالے کر دینا چاہئے۔ چینیوں کے الفاظ میں "دوبارہ تعلیم کے لئے"۔

انٹرنیٹ پر اس طرح کے ان گنت شرارتی لوگ بے لگام گھوم رہے ہیں۔ اگر آپ اپنی ذہنی کیفیت برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے میلز کو بغیر پڑھے ڈیلیٹ کر دیں۔ ان کے نام اور ای میل ایڈریس بلاک لسٹ میں ڈالدیں تاکہ ان کی ای میل سیدھی کچرے کے ڈبے میں چلی جائیں۔

انٹرنیٹ ہر قسم کی افواہوں، دھوکوں اور جعلسازیوں کا گھر ہے، جہاں لاکھوں لوگ جاننے کی خواہش یا حرص کے باعث اس کا شکار ہوتے ہیں۔ انہی خطرات کے پیش نظر FBI کے ایک شعبہ نے اس پر نظر رکھی ہوئی ہے۔ وہ لوگوں کو ان خطرات سے مطلع کرتا ہے جو انٹرنیٹ پر گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

(بشکریہ ڈیلی ٹائمز)

سیاستدانوں کو بدنام کرنے میں انٹرنیٹ کا حصہ

ہمارے اردگرد کیا ہو رہا ہے؟ منفی یا مثبت تبدیلیوں کے پس پردہ کون سے عوامل کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ مفادات کیسے بنتے اور اپنی شکلیں تبدیل کرتے رہتے ہیں؟ یہ سب ہمیں میڈیا کی وساطت سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا جو کچھ میڈیا ہمیں بتاتا یا دکھاتا ہے وہ درست اور مصدقہ ہوتا ہے؟ اس کا جواب "ہاں" میں دینا غیر درست ہوگا کیونکہ میڈیا کی دی گئی اطلاعات کے غیر مصدقہ یا نادرست ہونے کے بارے میں آج کل خود میڈیا میں ہی ذکر ہوتا رہتا ہے۔ ممبران قومی اسمبلی کے حوالے سے یہ انفارمیشن انٹرنیٹ پر دی گئی جسکے غلط ہونے کے بارے میں انٹرنیٹ پر مزید انفارمیشن دیکھی گئی ہے۔ انٹرنیٹ پر فراہم کی گئی انفارمیشن بغیر تصدیق کے دیئے جانے کی یہ کوئی منفرد مثال نہیں ہے۔ چونکہ اس انفارمیشن کا تعلق پاکستان کی قومی اسمبلی کے معزز ممبران کو ملنے والی مالی سہولیات سے ہے اس لئے اس "انفارمیشن" کا ذکر یہاں کیا جا رہا ہے۔ 4 اگست 2008 کو درج ذیل ذریعے سے اطلاع فراہم کی گئی:

(SPN) RE: Salary & Govt. Concessions for a Member of NATIONAL AS SEMBLY (MNA)

ایک ممبر قومی اسمبلی (MNA) کو ملنے والی ماہانہ تنخواہ اور دیگر سہولیات:

ماہانہ تنخواہ:	120,000 سے 200,000 روپے
آئین سازی کیلئے ماہانہ خرچ:	100,000 روپے
ماہانہ دفتری اخراجات:	140,000 روپے
سفری ماہانہ سہولت:	48,000 روپے
اسمبلی کی کارروائی کے دوران یومیہ خرچ:	500 روپے

مندرجہ نقد فائدے کے علاوہ

پاکستان بھر میں ٹرین کے فرسٹ کلاس ائرکنڈیشن میں سفر کی ہر وقت سہولت، ایک سال کے دوران (بیوی اور سیکرٹری سمیت) ہوائی جہاز کی بزنس کلاس میں 40 دوروں کی سہولت، پورے ملک میں حکومت کے قائم ہاسٹلز میں مفت رہائش کی سہولت، گھریلو استعمال کیلئے بجلی کے پچاس ہزار (50000) یونٹ (یہ واضح نہیں کہ یہ سہولت سالانہ ہے یا ماہانہ)، ٹیلیفون کی ایک لاکھ ستر ہزار (170,000) فری لوکل کالز۔ مذکورہ تمام سہولیات کا سالانہ میزانیہ 32,000 روپے لکھا ہے جبکہ نقد رقم جو اوپر درج ہے صرف اس کا میزان 408,000 سے 488,000 روپے بنتا ہے جبکہ اس میزان میں "اسمبلی کی کارروائی کے دوران یومیہ خرچہ" جو 500 روپے روزانہ ہے وہ شامل نہیں کیا گیا۔

انٹرنیٹ پر فراہم کردہ مذکورہ انفارمیشن کی درستگی کرتے ہوئے محترمہ روبینہ سہگل نے بتایا کہ ہمارے ممبران قومی اسمبلی کو ملنے والی سہولیات جنکی تصدیق ان کے مطابق MNA's handbook اور رسیدوں سے کی گئی ہے' اور محترمہ ماروی سرمد، جنہوں نے اس حوالے سے فراہم کی گئی انفارمیشن کو "قومی اسمبلی کے طریق کار اور قواعد 2007 کے کتابچہ" سے حاصل کیا ہے اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

تفصیل	روبینہ سہگل	ماروی سرمد
ماہانہ بنیادی تنخواہ:	19,838 روپے	17,200 روپے
مہمانداری الاؤنس:	5,000 روپے	5,000 روپے
ماہانہ دفتری اخراجات:	8,000 روپے	8,000 روپے
ٹیلیفون الاؤنس:	10,000 روپے	10,000 روپے
مجموعی ماہانہ تنخواہ:	42,838 روپے	40,200 روپے
کٹوتی کرایہ مکان:	4,000 روپے	4,000 روپے
نقد قابل ادائیگی تنخواہ:	38,838 روپے	36,200 روپے

اسکے علاوہ اسمبلی کی کارروائی کے دوران یومیہ الاؤنس جو اسمبلی کی کارروائی سے تین دن پہلے اور تین دن بعد اور سٹینڈنگ کمیٹی کی میٹنگ کیلئے دو دن پہلے اور دو دن بعد کیلئے ہوتا ہے۔

یومیہ الاؤنس:	1,000 روپے
رہائشی الاؤنس:	2,000 روپے
ٹریول الاؤنس:	750 روپے
میزان الاؤنس:	3,750 روپے یومیہ (جب اسمبلی کی کارروائی جاری ہو)

نوٹ: مذکورہ الاؤنسز سے دونوں خواتین متفق ہیں۔

انٹرنیٹ کی سیاسی افواہیں اور میڈیا کا نوخیز "ایکو سسٹم"

انٹرنیٹ پر سیاسی افواہیں کیا گل کھلاتی ہیں' اس کا اندازہ امریکی صدارتی امیدوار بارک اوبامہ کو اس وقت ہوا جب نامزدگی کی مہم کے دوران ان کے جہاز میں سفر کرنے والے قومی اخباری گروپ کے ایک رپورٹر نے ان سے ان کی بیوی کی ایک ویڈیو کے بارے میں انٹرنیٹ پر پھیلائی جانے والی افواہوں کے بارے میں سوال کیا کہ انہوں نے سفید فام امریکیوں کے بارے میں ہتک آمیز الفاظ کہے ہیں۔ اوبامہ رپورٹر پر برس پڑا "ای میل کے ذریعے گند اور جھوٹ پھیلایا جا رہا ہے۔ وہ گند کو اتنا اچھالتے ہیں کہ ایک قومی اخبار کا رپورٹر بھی مجھ سے اس بارے میں سوال کرتا ہے۔ اس سے بات اور پھیلتی ہے۔ اگر کسی کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ میں نے، میری بیوی نے یا ہم میں سے کسی نے کوئی نامناسب بات کی ہے تو وہ اسے سامنے لائے"۔ مبارک ہو کہ قومی میڈیا نے ایک "ایکو سسٹم" دریافت کر لیا ہے۔ بلاگ اور ای میل کے ساتھ نئے باہمی رشتے کے ذریعے کسی کو بھی جھوٹ اور پروپیگنڈے کے زور پر ڈبو سکتے ہیں۔

اوبامہ نے مزید کہا کہ عام لوگ اس کھیل میں شریک نہیں ہوتے۔ یہ سیاست کا ایک تباہ کن پہلو ہے۔ صرف اس وجہ سے کسی بات کو سچ نہیں مان لینا چاہیے کہ وہ ای میل کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پریس کا کام یہ نہیں کہ وہ بدنیتی پر مبنی اس قسم کی افواہیں پھیلائے۔

روزنامہ "گارجین" کے جان ناٹن لکھتے ہیں کہ میڈیا کے اس نئے "ایکو سسٹم" کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ضابطہ اخلاق کے بارے میں سوالوں نے ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ مثال کے طور پر کیا کسی ذمہ دار اخبار یا بلاگ کو کسی مشکوک آن لائن ذریعے (source) سے حاصل کردہ اطلاع یا کسی بھی مواد کے بارے میں اس Link کا حوالہ دینا چاہیے؟ ایسا اس لئے نہیں کیا جانا چاہیے کیونکہ اس طرح مشکوک سائٹ کی حیثیت مستحکم ہوتی ہے۔ اس سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے لیکن اس کیلئے روایتی صحافیانہ مہارت اور اقتدار کی ضرورت ہے۔ یہ حقیقت کہ کوئی چیز انٹرنیٹ پر گردش کر رہی ہے بجائے خود کوئی خبر نہیں۔ انٹرنیٹ پر تو آپ کو ہر چیز مل سکتی ہے۔

انٹرنیٹ پر پھیلائی جانے والی افواہوں کا توڑ کیا ہو اس کی ایک مثال "ریزن" میگزین کے ڈیوڈ وٹکل نے فراہم کی ہے۔ وہ میری جانسن کے پیچھے پڑ گئے جنہوں نے اپنے بلاگ کے ذریعے مسز اوبامہ کے بارے میں سب سے پہلے افواہ پھیلائی تھی اور جس نے آخر کار اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے ہسٹیریا کی شکل اختیار کر لی۔ وٹکل کی انوسٹی گیشن کا نتیجہ یہ نکلا کہ کوئی ویڈیو ٹیپ سرے سے تھی ہی نہیں۔

(بشکریہ ڈیلی گارجین)

امریکہ میں میڈیا اصلاحات کی تحریک زور پکڑ گئی

ترقی یافتہ ممالک خصوصاً امریکہ میں میڈیا کی یلغار سے تنگ آ کر میڈیا میں اصلاحات کی تحریکیں اٹھ کھڑی ہوئیں ہیں۔ امریکہ میں میڈیا اصلاحات کے لئے سرگرم ایک گروپ 'فری پریس' کے زیرِ اہتمام گزشتہ جون میں مینا پولس میں "قومی کانفرنس برائے میڈیا اصلاحات 2008" کا انعقاد ہوا جو ملک میں اپنی طرز کا سب سے بڑا اجتماع تھا۔ فری پریس کے بانی رابرٹ میکزنی نے کانفرنس کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ امریکی میڈیا سسٹم شدید بحرانوں کا شکار ہے اور امریکی یہ جان گئے ہیں کہ اب میڈیا موجودہ شکل میں قابلِ قبول نہیں۔ انہوں نے کہا کہ دو انتہائی اہم تبدیلیوں کی وجہ سے گزشتہ پانچ برسوں کے دوران میڈیا اصلاحات کی تحریک نے زبردست زور پکڑا ہے۔ ان میں سے ایک تبدیلی 'ٹیکنیکی انقلاب' ہے جس نے پوری میڈیا انڈسٹری کے کاروباری طور طریقوں کو بدل کے رکھ دیا ہے جس کی بنا پر میڈیا سسٹم کی بڑے پیمانے پر اصلاح کے لئے قواعد و ضوابط تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ جبکہ دوسری تبدیلی یہ بڑھتا ہوا احساس ہے کہ امریکہ میں صحافت بُری طرح تنزلی اور ٹوٹ پھوٹ (Disintegrating) کا شکار ہے اور لوگ اس امر سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ مسئلہ صرف صحافت کے مندرجات کا نہیں، ان صحافیوں کی تعداد میں تیزی سے کمی کا ہے جو عام لوگوں کے بارے خبریں دیا کرتے تھے۔ اب بہت سے ایسے شعبے ہیں جو امریکی صحافت میں جگہ نہیں پاتے۔ آپ جس شہر میں رہتے ہیں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔ بیرونی دنیا کی کوریج کا بھی یہی حال ہے۔ گلوبلائزیشن اور دنیا میں امریکی رول کے باوجود آج دنیا کی کوریج کے لئے رپورٹروں کی تعداد اس سے کم نہیں جو 25 برس پیشتر تھی۔ میکزنی کا کہنا تھا کہ یہ صورت حال میڈیا کے شدید بحران کی عکاسی کرتی ہے۔ لوگوں نے اب کہنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں اس بارے میں کچھ کرنا پڑے گا اور یہی بات تحریک کو مضبوط کر رہی ہے۔

بھارتی میڈیا کا سوشل پروفائل

یوگندر یادو سینٹر فار اسٹڈی آف ڈویلپمنٹ سوسائٹیز نئی دہلی کے سینئر فیلو اور پروفیسر نے بھارتی میڈیا میں اہم فیصلہ ساز عہدوں پر فائز افراد کے بارے میں ایک سروے کروایا جس کا نتیجہ درج ذیل ہے:

بھارتی 'قومی میڈیا' میں سماجی تنوع کا فقدان ہے۔ یہ ملک کے سماجی خاکے کا عکاس نہیں۔

- ہندوؤں کی اونچی ذات کے مرد میڈیا پر حاوی ہیں جو کہ بھارت کی آبادی کا آٹھ فیصد ہیں مگر میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر ان کا تناسب 71 فیصد سے بھی زیادہ ہے۔
- صنفی تعصب صرف 17 فیصد عورتیں اہم فیصلہ ساز عہدوں پر فائز ہیں جبکہ انگریزی کے الیکٹرونک میڈیا میں ان کا تناسب 32 فیصد ہے جو مناسب ہے۔
- میڈیا میں ذات پات کے لحاظ سے بھی برابر نمائندگی نہیں۔ اونچی ذات کے ہندو جن میں برہمن، راجپوت، کھتری وغیرہ شامل ہیں جو آبادی کے 16 فیصد ہیں مگر میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر 86 فیصد کے قریب ہیں۔ ان میں صرف برہمن ہی 49 فیصد میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر براجمان ہیں۔
- دلت (اچھوت) اور قبائلیوں کی میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر عدم موجودگی واضح نظر آتی ہے۔ 315 اہم فیصلہ ساز عہدوں میں سے ایک بھی ان ذاتوں کے پاس نہیں۔
- بھارتی میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر دیگر پسماندہ ذاتیں بھی انتہائی حد تک کم ہیں۔ یہ آبادی کا 40 فیصد ہیں مگر میڈیا میں صرف چار فیصد ہیں۔
- میڈیا میں مسلمانوں کی نمائندگی بھی خطرناک حد تک کم ہے۔ یہ میڈیا کے اہم فیصلہ ساز عہدوں پر صرف تین فیصد ہیں جبکہ ان کا آبادی میں تناسب 13.4 فیصد ہے۔
- عیسائیوں کی بھارتی میڈیا میں متناسب نمائندگی ہے (خاص طور پر انگریزی میڈیا میں) یہ آبادی کا 2.3 فیصد ہیں مگر میڈیا میں چار فیصد کے قریب ہیں۔
- سماجی گروپ جو دوہرا خسارہ برداشت کرتے ہیں وہ بھی اہم فیصلہ ساز عہدوں پر موجود نہیں۔ دیگر پسماندہ ذاتوں کے اہم عہدوں پر کوئی بھی عورت نہیں جبکہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

یہ نتیجے 315 اہم فیصلہ ساز عہدوں کے سماجی پس منظر کے سروے پر مبنی ہیں (جس میں کسی بھی خبر رساں ادارے کے چیدہ دس اہم فیصلہ ساز عہدے جو ادارے اور کسی خبر کی اشاعت کا فیصلہ کرتے ہیں، شامل ہیں)۔ اس سروے میں دہلی میں موجود بھارتی ذرائع ابلاغ کے 37 ادارے (اخبارات، میگزین، نشریاتی چینل اور نیوز ایجنسیاں) شامل ہیں۔

اشتہاروں میں خواتین کا استحصال

''روزن'' اسلام آباد میں کام کرنے والی ایک این جی او ہے جو خواتین کے خلاف تشدد، نفسیاتی صحت اور بچوں کے علاوہ بالغ افراد کی تولیدی صحت جیسے موضوعات پر کام کرتی ہے۔ اس تنظیم نے خواتین کو اشتہاروں میں شہوت انگیزی کے طور پر دکھائے جانے کے حوالے سے ایک سیمینار کا انعقاد اسلام آباد میں کیا۔ میڈیا کے اس رخ کی تصویر کشی قابل توجہ بھی ہے اور اصلاح طلب بھی۔ سیمینار میں سینما اور ٹی وی کے اشتہاروں میں عورتوں کو جنسی ہوس کی علامت کے طور پر پیش کرنے کو نہایت سخت تنقیدی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ رویہ خواتین کے استحصال کا باعث ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر ان کی شخصیت کو بگاڑتا بھی ہے۔ جس طور خواتین کو فحش اشتہاروں میں بگاڑ کر پیش کیا جاتا ہے اس سے قدامت پسند لوگوں میں انتہا پسندانہ رویوں کو فروغ ملتا ہے۔

سیمینار میں مقررین نے میڈیا کے اس رول پر تفصیلی گفتگو کی جو لوگوں کی رائے تشکیل دینے اور ان کے رویوں پر اثر انداز ہونے سے متعلق ہے۔ مقررین نے ان خیالات کا اظہار کیا کہ لوگوں کی اکثریت اشتہارات میں پیش کردہ گھٹیا پن کے باعث منفی اثرات کا شکار ہو جاتی ہے اور اس کا منفی اثر خصوصاً نوجوانوں پر دیکھنے میں آتا ہے۔

غازی صلاح الدین جو ایک معروف کالم نگار ہیں انہوں نے بتایا کہ خواتین پر تشدد کی رپورٹوں کو میڈیا میں کس انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ پرنٹ میڈیا میں اس قسم کی رپورٹنگ کرتے ہوئے اس امر کو نظر انداز کیا جاتا ہے کہ اس طریقے کی رپورٹنگ سے ایک تو مظلوم کا وہ اعتماد مجروح ہو جاتا ہے جس کی اسے اشد ضرورت ہوتی ہے، دوسرے مظلوم کے حوالے سے جس نزاکت کا قائم رہنا ضروری ہے وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔

ایک اور صحافی ابصار عالم نے بتایا کہ ہر قسم کی مصنوعات کو فروخت کرنے کے لئے خواتین کو کس طرح ایک بکاؤ چیز کے طور پر برتا جاتا ہے۔ ایک پرکشش پریزنٹیشن کے ذریعے انہوں نے مختلف النوع اشتہارات کا موازنہ پیش کیا جن میں ایک یا ایک سے زیادہ عورتیں بطور سیلز گرل ایسی مصنوعات فروخت کرتی ہیں جن کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

فریال گوہر نے سینما میں عورتوں کی تصویر کشی کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اردو، پنجابی اور پشتو زبان کی فلموں سے ایسی تصاویر دکھائیں جن کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ عورتوں کو اس طرح پیش کرنا جس کا مقصد محض مردوں کی جنسی ہوس کی تسکین کرنا ہوتا ہے اور پھر ایسے ہی مردوں کو جسے ضرورت بندوق بردار دشمنوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

چینل ڈسکشن کے بعد 'صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے' کے مصداق حاضرین کو دعوت کلام دی گئی۔ SPO کے چیف ایگزیکٹو، حارث خلیق نے اس سیشن کی صدارت کی۔ اس موقع پر دور دراز کے علاقوں میں کام کرنے والے صحافیوں کو درپیش مشکلات و مسائل پر بھی گفتگو ہوئی جنہیں اپنے کام کی نوعیت کے مطابق آج کی پیشہ ورانہ سہولتیں بھی میسر نہیں ہیں جو ان کے کام کا اہم تقاضہ ہیں۔

انسانی حقوق کی سرگرم کارکن طاہرہ عبداللہ نے پر اعتماد انداز میں کہا کہ معاشرے میں خواتین کے کردار کو کم کر کے اسے محض ایک مکینیکل صنفی کردار تک محدود کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اب اس سے آگے کے بارے میں سوچیں۔

پراجیکٹ کوآرڈینیٹر شبانہ عارف نے حاضرین کو بتایا کہ پدری سماجی نظام کی اقدار کس طرح عورتوں کی اہمیت کو کم کر کے انہیں ایک ثانوی حیثیت تک محدود کر دیتی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میڈیا میں خواتین کی تصویر کشی اکثر مثبت انداز میں نہیں ہوتی کیونکہ سوسائٹی قدامت پسندانہ روایتی انداز فکر کی حامل ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عورتوں کے خلاف تشدد کے واقعات کی رپورٹنگ میں مظلوم کی رازداری کے پہلو کو نظر انداز کیا جاتا ہے اور عموماً اس کے بارے میں حتمی رائے قائم کر لی جاتی ہے۔ انہوں نے پراجیکٹ 'مسلک' کے بارے میں وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ یہ پراجیکٹ اس قسم کی ناانصافیوں کو ختم کرنے کیلئے اپنے ورکنگ ایریا میں رپورٹروں، فوٹوگرافروں، شعبہ صحافت میں آنے والے نئے صحافیوں اور میڈیا کے اداروں کے ساتھ ورکشاپس کے ذریعے اس ناانصافی کے خلاف برسرپیکار ہوگا۔

وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات شیری رحمان نے حساس مسئلوں سے نمٹنے کیلئے 'روزن' کی کاوشوں کو سراہا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ویمن ڈویلپمنٹ کی وزارت کے پاس صنفی ایشوز سے متعلق پراجیکٹس پر کام کرنے کیلئے مناسب فنڈز نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانہ صحافت کو یاد کرتے ہوئے بتایا کہ کیسے ہر ایک سٹوری کے پس منظر میں عورت کو شامل کیا جاتا تھا حتیٰ کہ اس سٹوری سے عورت کا کوئی تعلق بھی نہیں ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس وزارت کے تحت صنفی کرائم سیل کو مضبوط بنانے کا ارادہ رکھتی ہیں اور بتایا کہ خواتین کے حقوق کے تحفظ پر بھی تین بل وزارت قانون کو بھیجے جا چکے ہیں۔

ماریہ رشید کوآرڈینیٹر 'روزن' نے میڈیا اور این جی اوز کے مابین فاصلوں کو کم کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے میڈیا میں ماضی قریب کے چند سالوں میں خواتین کے مسائل پر توجہ دینے کے عمل کو سراہتے ہوئے اسے ایک اچھا شگون قرار دیا۔

باھمی رابطوں ...... یا موجود رشتوں میں بگاڑ کا ایک ذریعہ

رات بھر کی بارش کے بعد وہ ایک بہت خوبصورت صبح تھی جب ہم جنوبی فرانس کے پہاڑوں پر چل رہے تھے۔ سرسبز پودے اور درخت ایک بھرپور زندگی پیش کر رہے تھے۔ گائے بکریاں کھیتوں میں گھوم پھر رہی تھیں اور نیلگوں آسمان میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اچانک مجھے ایک مدہم سا شور سنائی دیا جو کسی پرندے کی آواز نہیں تھی۔ میرے ساتھ اٹلی کا ایک دوست جس کو اس ٹھنڈی خوشگوار صبح میں بُری طرح سانس چڑھا ہوا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھا اس نے وہ آواز سنی اور کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اپنا موبائل فون نکالا۔ یہ اس کی ماں کا فون تھا جو یہ معلوم کر رہی تھی کہ کیا وہ اپنے ہائیکنگ ٹرپ کے شروع میں ٹھیک ہے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ اور خوشگوار صبح کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے وہ اگلے دس منٹ صرف اس شخص سے بات کرتا رہا جو اس جگہ موجود نہیں تھا۔

یہ ایک ماہ لمبی ہائیکنگ کی شروعات تھی۔ جب میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنے کام سے چھٹی لوں گا جس میں میرا اپنے موبائل فون اور کمپیوٹر سکرین سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہو گا۔ اس مرتبہ اس فرار کو میں نے تھوریو (ایک امریکی لکھاری) کے تناظر میں دیکھا جس کے مطابق "میں اپنے اوزاروں کا قیدی بن گیا ہوں"۔

اپنے ساتھی کے ساتھ ہائیکنگ پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے ایک دلچسپ مضمون پڑھا تھا جس میں لکھنے والا مسافروں سے بھری ایک بس میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے شخص کا موبائل فون بجا اور اس شخص نے اس فون کال کا جواب دینے کی بجائے فون کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میں ایک دم چونک گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور بہت لاپرواہی سے اپنا منہ موڑ لیا۔ میں کچھ سمجھا نہیں کہ آیا یہ موبائل اس کا اپنا تھا یا چوری کا تھا یا پھر اس کو معلوم ہی نہیں ہے کہ موبائل فون کیا چیز ہوتی ہے۔ تاہم، بظاہر لاپرواہی کے انداز میں اس نے اپنے آپ کو اس چیز سے آزاد کر لیا جو مجھے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔

یہ کہانی میرے ذہن میں بار بار گونجتی ہے۔ آج کل دوسرے لوگوں کی طرح میرا روزگار بھی باہمی رابطوں پر منحصر ہے۔ آن لائن یا پھر موبائل فون کے ذریعے۔ مگر پانچ سالوں میں موبائل فون مجھے ایک نشے کی طرح لگ چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس موبائل فون نے دنیا سے تعلق جوڑنے کی بجائے میرے اور لوگوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے اور یہ صرف میرے ساتھ ہی نہیں ہے۔ جب میں سپین کے پہاڑوں میں ہائیکنگ کر رہا تھا تو مجھ پر عیاں ہوا کہ موبائل فون کا استعمال کس طرح دھیرے دھیرے ہماری زندگیوں کے ہر پہلو پر اثر انداز ہو گیا ہے اور ستم ظریفی کی حد تک باہمی انسانی ابلاغ کو کمزور کر دیا ہے جو کسی کمیونٹی کا تانا بانا ہے۔

دنیا میں کروڑوں لوگ موبائل فون کا استعمال کرتے ہیں یورپ کے کچھ ملکوں میں تو موبائل فون کی تعداد وہاں کی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ گو کہ موبائل فون باہمی روابط اور تعلقات کا بہترین ذریعہ ہو سکتا ہے جو ہمیں دفتر کے محدود کمرے سے آزادی دینے کے علاوہ اور بھی خوشگوار وقت مہیا کرتا ہے مگر بعض اوقات یہ سب کچھ الٹا بھی ہوتا ہے۔ موبائل فون نے ہمارے دفتری اور غیر دفتری اوقات کو گڈمڈ کر دیا ہے۔ خاندان اور دوستوں کے درمیان ذہنی فشار اور دباؤ کو بڑھا دیا ہے۔ امریکی یونیورسٹی کے سائیکالوجی کے اسسٹنٹ پروفیسر اپنی ایک رپورٹ میں کہتے ہیں "آنے والی نسلوں کیلئے تعلقات کی غیر واضح حدود کا سوال غیر متعلق ہو سکتا ہے کیونکہ وہ زندگی کو کسی اور انداز سے دیکھ ہی نہیں سکتے ہوں گے۔ جتنا زیادہ ہم رابطے میں ہیں اتنا ہی الگ تھلگ ہو رہے ہیں"

سپین کی ہائیکنگ پر واپس چلتے ہیں جہاں میں نے بہت بڑی تعداد میں یہ کھیل دیکھا۔ گو کہ میں اپنے تمام سفر کے دوران موبائل فون سے آزادی کے مزے لے رہا تھا مگر میں نے اپنے ارد گرد بہت سے لوگوں کو جن میں یورپین بھی شامل تھے، تمام دن اپنے گھر والوں اور دوستوں کو فون کرتے اور میسج (SMS) کرتے دیکھا۔ لوگ اجنبی لوگوں سے دوستیاں بنانے اور ان لوگوں کو جنہیں وہ پہلے سے جانتے ہیں فون کرنے میں بٹ گئے تھے۔ اگر میں اپنے آپ کو دیکھوں تو میں بھی اکثر یہی کرتا ہوں کہ کسی ڈاک خانے یا بس اسٹاپ پر کسی اجنبی سے بات کرنے سے بہتر ہے کہ میں فون کروں یا کسی کو میسج۔ اس طرح سے میں اپنے آپ کو ایک بہت ہی مفید مباحثے سے دور کر لیتا ہوں اور نئے دوست بھی نہیں بنا سکتا۔ میں اکثر چلتے ہوئے اپنے موبائل فون پر بات کرتا ہوں اور اس دوران میں اپنے آس پاس کے ماحول اور لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہوں جیسا اس دن پہاڑوں پر اٹلی کے ہائیکر نے کیا۔ اگر ہم اپنے محلے داروں سے آمنے سامنے بات نہیں کر سکتے اور چلتے ہوئے ارد گرد کے ماحول کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تو یہ موبائل فون ہم لوگوں اور ہمارے خاندان کو پانچ سالوں کے بعد کہاں لے جائے گا؟

جارجیا کی رہنے والی ایک خاتون نے NBC-TV کو بتایا کہ وہ ہر وقت اپنی بیٹی اور دوستوں کو میسج کرتی رہتی ہے۔ جارجیا کے ایک شہر آگستا میں ایک موبائل فون کے سروے کے مطابق ان کے 50 فیصد صارفین ایک ہفتے میں کم از کم 100 میسج یا تو بھیجتے ہیں یا وصول کرتے ہیں۔ جارجیا یونیورسٹی کے کیمونیکیشن کے ایسوسی ایٹ پروفیسر نے بتایا کہ "میسج کرتے ہوئے شاید ہم ایک دوسرے سے تعلق تو رکھ رہے ہوتے ہیں مگر میسج کرنا ایک غیر شخصی معاشرے کی طرف لے جا رہا ہے۔ میسج کرنے والے ایک دوسرے سے ابلاغ نہیں کر رہے ہوتے کیونکہ وہ اپنے چہرے کے تاثرات نہیں بتا سکتے جیسے وہ مسکرا نہیں سکتے اور پھر اس طرح وہ جب کسی سے بات بھی کریں گے تو بھی نہیں مسکرائیں گے۔"

جس تیزی سے موبائل فون کا استعمال بڑھا ہے اتنی ہی تیزی سے موبائل فون اور میسج نے بالمشافہ ملاقاتوں اور تعلقات کی جگہ بھی لے لی ہے۔ یونیورسٹی کے ایک طالبعلم کہتے ہیں کہ موبائل فون اور میسجنگ کا بہت تیزی سے بڑھنا انسان کی کمیونیکیشن کو نقصان دے رہا ہے فائدہ نہیں۔" ہم آمنے سامنے بات کرنے کی بجائے اپنے آپ کو موبائل فون میں چھپا لینے کو ترجیح دیتے ہیں یا بالکل ہی بات نہیں کرتے۔" وہ کہتے ہیں "تخفیف شدہ کمیونیکیشن ہمارے احساسات کا اظہار نہیں کر سکتی۔ YOU کو U سے تبدیل کرنے سے کیا مشکل آسان ہو جائے گی؟ الفاظ کے اور حروف کے غلط استعمال سے ہم یہ بھی بھول جائیں گے کہ فہم و فراست کی گفتگو کیسے کی جاتی ہے اور اس میں الفاظ کی کیا اہمیت ہے۔ اس طرح ہم اپنی کمیونیکیشن کی صلاحیتوں کو کمزور کر رہے ہیں۔"

بہت زیادہ جڑے رہنے سے ایک اور خدشہ بھی ہوتا ہے۔ جب میں ہائیکنگ کر رہا تھا تو بعض دفعہ میں راستہ بھٹک جاتا تھا اور ایسے انہونے اور خوبصورت مناظر دیکھتا تھا جو شاید بھٹکے بغیر نہ دیکھ سکتا۔ جب میں امریکہ میں ہوتا ہوں اور اگر کوئی راستہ بھول جاؤں تو کسی دوست کو موبائل سے فون کر کے صحیح راستہ پوچھ لیتا ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ موبائل فون کے ہوتے ہوئے آپ نئے راستے نہیں ڈھونڈ سکتے اور نہ ہی نئے لوگوں سے روابط قائم کر سکتے ہیں۔

میں کچھ دنوں پہلے ہی اپنے گھر واپس آیا ہوں اور میں نے اپنے موبائل فون سے جان چھڑا لی ہے ایک پرانی زنگ آلودہ موٹر سائیکل کے بدلے ایک عام سا فون لے لیا ہے جو گھر کی دیوار پر ٹنگا رہتا ہے۔ اب جب میں گھر سے باہر جاتا ہوں تو فوری طور پر مجھے اپنے فون کال چیک کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اب میں اپنے ہمسائے میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو پہلے نہیں دیکھ پاتا تھا، جیسے ایک بہت بڑا باغیچہ جو میرے گھر کے قریب بنا ہے اور ایک بہت خوبصورت مجسمہ جو میرے گھر کے قریب ہی گھر کے باہر لگا ہے۔ اب میں اپنے موبائل فون سے چپکا نہیں رہتا بلکہ اپنے محلے اور مارکیٹوں میں نئے لوگوں سے ملتا ہوں جن سے پہلے میں نے کبھی بات نہیں کی تھی۔ اپنے دوستوں سے بالمشافہ مل کر موبائل فون کے مقابلے میں پہلے سے زیادہ باتیں کرتا ہوں۔ دنیا سے کٹ جانے کی بجائے موبائل فون کے بعد میں لوگوں کے زیادہ قریب ہو گیا ہوں۔

تمباکو نوشی کے موضوع پر

ایک بھارتی نوعمر لڑکی کی ڈاکومنٹری

نوعمری میں طلباء و طالبات عموماً اپنا وقت کیسے بیکار میں گپ شپ کرتے، موبائل پر دوستوں کے ساتھ نہ ختم ہونے والی چیٹنگ میں، یا پھر سینما ہاؤس میں نئی نئی فلمیں دیکھنے میں صرف کرتے ہیں، لیکن نوعمر شوبھا شرما نے جو ابھی سکول سے فارغ ہوئی ہے اپنے سر ایک بہت ہی سنجیدہ ذمہ داری لے لی ہے۔ شوبھا شرما نے تمباکو نوشی جیسے سنجیدہ موضوع پر ایک ڈاکومنٹری بنائی ہے۔ اس فلم میں اسکی تخلیقی صلاحیتوں کا بہت واضح اظہار نظر آتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس ڈاکومنٹری نے ایک طرح سے بھارتی معاشرے کو چیلنج کر دیا ہے۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے یہ دستاویزی فلم دیکھی ہے انہوں نے اس نوعمر بھارتی ہوئی فلم سازی کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

اسکے ایک دوست نے شرما کی سب سے کم عمر فلم ساز شوبھا کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سکول میں وہ ایک بگڑی ہوئی اور اپنے دوستوں سے خوف زدہ سی لڑکی تھی لیکن اس تہلکہ خیز تخلیق نے اسکی شخصیت کا مختلف روپ لوگوں کے سامنے پیش کیا ہے۔

شوبھا حال ہی میں سینٹ ذیویئر کالج سے فارغ ہوئی ہے اور اس نے دستاویزی فلم میں پہلا جو تمباکو نوشی ترک کرنے کے موضوع کا احاطہ کئے ہوئے ہے، مکمل کی ہے۔ چودہ منٹ دورانیے کی اس فلم میں بڑے فلم سازوں جیسی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ایک مختلف اور امتیازی سکرپٹ، موزوں انداز بیان اور موضوع کے اعتبار سے نہایت مناسب لوکیشن کا انتخاب۔ اس کا کام مشہور فلم ساز آنند پٹوردھن کی ہنرمندی سے مماثلت رکھتا ہے۔ اس نے یہ تمام کام بارہویں جماعت کے بورڈ کے امتحانات کے دوران کیا اور وہ سب سے کم وقت میں اپنی پہلی فلم کی تکمیل کی۔

نوعمر فلم ساز نے بتایا کہ پہلے میں نے تمباکو نوشی ترک کرنے کے رجحان کا تفصیلی مطالعہ کیا، اسکے انسانی صحت پر کیا اثرات پڑتے ہیں اور اب تک حکومت نے اس ضمن میں کیا کیا ہے۔ دوسرا مرحلہ سکرپٹ کا انتخاب اور تیسرا مرحلہ اس تمام کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا۔ یہ بات یقیناً حیران کن ہے کہ فلم بنانے کیلئے جو واحد آلہ شوبھا کے پاس تھا وہ صرف ایک کیمرہ تھا۔ موبائل کیمرہ۔ ترک تمباکو نوشی کے حوالے سے کام کرنے والے ایک معروف اور سرگرم کارکن کی بیٹی سے میں نے اس کا کیمرہ مستعار لیا۔ یہ کیمرہ صرف تین سیکنڈ کی ویڈیو ریکارڈنگ کی اہلیت رکھتا تھا جبکہ شوبھا نے اس سے کئی گھنٹوں کی شوٹنگ کر ڈالی۔

چودہ منٹ دورانیے کی اس فلم میں بڑے فلم سازوں جیسی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ایک مختلف اور امتیازی سکرپٹ، موزوں انداز بیان اور موضوع کے اعتبار سے نہایت مناسب لوکیشن کا انتخاب۔

شوبھا نے اپنے کام کرنے کے انداز کے بارے میں بتایا کہ میں چند سیکنڈ کی شوٹنگ کرتی اور فوراً اسے اپنے لیپ ٹاپ پر منتقل کر دیتی۔ یہ عمل میں بار بار دہراتی جب تک کہ سین مکمل نہ ہو جاتا اور پھر یہی عمل دوسرے سین کیلئے بار بار شروع سے شروع کرنے کیلئے کرتی۔

میں نے جولائی 2008 میں واشنگٹن ڈی سی میں ٹوبیکو کنٹرول پر منعقد ہونے والی تیرہویں عالمی کانفرنس میں اپنی اس فلم کی نمائش کی۔ اس دوران میں امریکن یونیورسٹی میں بطور مہمان رہی۔

نوعمر فلم ساز نے بتایا کہ میرا مقصد اس فلم کو زیادہ سے زیادہ ایسی جگہوں پر دکھانا ہے جہاں پرنٹ میڈیا کی پہنچ نہیں ہے یا پھر لوگ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ پہلے میں نے اس فلم کو ہندی زبان میں بنایا ہے تاکہ عام ہندوستانی سمجھ سکے اور اب میں اسے عالمی سطح پر لے جانے کیلئے تیار ہوں۔

ایک بزنس مین کی بیٹی شوبھا نے کہا کہ تمباکو نوشی کے خلاف مہم کی طرف اس کا رجحان اس لئے ہوا کہ اس نے اپنے جاننے والوں میں ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھا جن کی صحت تمباکو نوشی کی وجہ سے تباہ ہوئی ہے۔

سکول میں شاریات اس کا پسندیدہ مضمون تھا اور اب وہ ذرائع ابلاغ میں مزید مطالعہ کی خواہش رکھتی ہے۔ موتی نگر کی رہنے والی فلم سازی کو بھی جاری رکھے گی۔ اپنے مشن کو جاری رکھنے کی خاطر وہ فلم 'ورین' کا دوسرا حصہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔

ہندی اور انگریزی زبان میں چودہ منٹ دورانیے کی یہ فلم انڈیا میں تمباکو نوشی کے گمراہ کن فروغ پر بنی ہے۔ تمباکو نوشی کے گمراہ کن فروغ، تمباکو کے انسانی صحت پر مضر اثرات، گمراہ کن تشہیر، ٹوبیکو کنٹرول ایکٹ اور پارلیمانی ایکٹ کی خلاف ورزیوں (سگریٹ اور تمباکو کی دوسری مصنوعات کا ایکٹ 2003) کا پول کھولتی ہے۔

دستاویزی فلم 'ورین' میں انڈیا میں تمباکو کے بڑھتے ہوئے مضر صحت اثرات اور تمباکو کے گمراہ کن فروغ کی روک تھام پر مبنی پالیسیوں کو فوکس بنایا گیا ہے تاکہ ہندوستان میں الکحل کی ممانعت سے متعلق شائع ہونے والے اشتہارات کے ساتھ ساتھ تمباکو نوشی کے فروغ کی بھی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔

تمباکو کو فروغ دینے والی کارپوریشنیں عشروں سے یہ جانتی ہیں کہ تمباکو نوشی موت اور کینسر کا سبب بنتی ہے (اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ہالی وڈ کی دستاویزی فلم موت کی تیاری میں یہ بتایا گیا تھا کہ دنیا کی سب سے بڑی تمباکو کمپنی فلپ موریس کے امریکہ میں موجود دفاتر سے ایسی دستاویزات دریافت ہوئی ہیں) اس کے باوجود وہ دانستہ طور پر دھوکہ دہی کرتے ہوئے زندگی کیلئے خطرناک اور دل کی امراض کی افزائش کا سامان مہیا کرتی ہیں۔ وہ جانتے بوجھتے ہوئے تمباکو کی مصنوعات کی تشہیر اور گمراہ کن فروغ کرتے ہیں جو زندگی کیلئے بلاواسطہ خطرناک اور کینسر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہیں۔ وہ تمباکو کی تشہیر اور فروغ سے ہماری نوجوان نسل اور بچوں کے ذہنوں میں سحر انگیزی اور تصوراتی زندگی کو اجاگر کرتے ہیں۔ تمباکو کا اصل چہرہ چھپایا جاتا ہے اور تمباکو کو عموماً کم نقصان دہ سمجھا جانے کو نمایاں کیا جاتا ہے۔

نہ صرف تمباکو کمپنیاں بلکہ دواساز کمپنیاں اور الکحل اور صحت کی صنعت بھی اپنا منافع بڑھانے کیلئے بیماری، معذوری اور موت کے اس کھیل میں ان کے ساتھ ہیں۔

ہندوستان میں الکحل کی تشہیر کی ممانعت کے باعث الکحل کمپنیاں اپنی مصنوعات کے جارحانہ فروغ کیلئے سوڈا واٹر، منرل واٹر، سی ڈی کیسٹ، کرکٹ وغیرہ جیسے تشہیر کے دیگر ذرائع استعمال کرتی ہیں۔ 31 مئی 2003 کو تمباکو اور تمباکو کی دیگر مصنوعات کے ایکٹ کے آنے کے بعد یہ کمپنیاں اس قسم کے اشتہارات کے فروغ کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ انڈیا ٹوبیکو کمپنی نے 250 سے زیادہ ریٹیل آؤٹ لیٹس (ویلز (الف سٹائل سٹورز)، گولڈ فلیک ٹورز جیتیں اور ریڈ اینڈ وائٹ بہادری ایوارڈ) گمراہ کن طریقوں سے تمباکو کے فروغ کی مثالیں ہیں۔

وہ جانتے بوجھتے ہوئے تمباکو کی مصنوعات کی تشہیر اور گمراہ کن فروغ کرتے ہیں جو زندگی کیلئے بلاواسطہ خطرناک اور کینسر اور دل کی بیماریوں کا باعث ہیں

اب یہ لوگوں کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ کارپوریشنوں کی اس منافع بخش سیاست کو سمجھیں۔ معاشی طاقت بالآخر لوگوں کے پاس رہنی چاہیے۔ ہر ایک پیسہ جو کارپوریشنیں کماتی ہیں وہ ہمارے ہی لوگوں سے لیا جاتا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مصنوعات ہمارے بچوں اور نوجوان نسل کے ذہنوں کو بھی گمراہ کر رہی ہیں تو پھر یہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم ان تمام اشیاء کا بائیکاٹ کریں۔ دانستہ طور پر ہمارے لوگوں کو نشے کا عادی بنانے کی وجہ سے ان کارپوریشنوں کو جواب دہ ہونا چاہیے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے لوگ زیادہ ہوشیار ہوں اور عام لوگوں کے مفاد میں پالیسیاں اور فریم ورک بنانے کیلئے جدوجہد میں شریک ہوں۔

Film Review: PAGE 3

”Page 3 اخبار کا وہ صفحہ ہے جس میں امیر اور مشہور لوگوں کے بارے میں چھاپا جاتا ہے۔ اسی لئے کوئی پورا اخبار پڑھے یا نہ پڑھے Page 3 ضرور پڑھتا ہے۔ اس صفحہ پر تصویر کا شائع ہونا کسی بہت بڑی کامیابی سے کم نہیں۔“ یہ اس فلم کے پہلے سین کے ڈائیلاگ ہیں۔

جعفر مہدی

ایک ایسا شخص جس کو کوئی نہیں جانتا کیسے میڈیا کے ذریعے اونچی سوسائٹی کا حصہ بن کر ایک بڑا بزنس مین بن جاتا ہے اور کیسے ایک لڑکی صحافت کو سیڑھی بنا کر فلمی دنیا میں اپنی جگہ بناتی ہے۔ اس فلم میں بہت مہارت کے ساتھ یہ دکھایا گیا ہے کہ آج کی صحافت مشہور اور امیر لوگوں کے گرد ہی گھومتی ہے اور قاری کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے دور رکھتی ہے۔ سماجی ذمہ داری اب میڈیا کا کام نہیں رہا۔ اب صحافت ایک طاقت ہے، جس کا سیاست میں بھی پورا عمل دخل ہے۔ اس کے علاوہ اس فلم میں صحافت کے اس پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ انگریزی اور مادری زبان میں فرق ہوتا ہے

صحافت میں قدم رکھنے والی ایک نئی لڑکی ماھوی (کونکونا شرما) جس کے ذمہ اخبار کا وہ صفحہ ہے جس میں فیشن، گلیمر، پارٹیز اور مصالہ بھری خبریں ہوتی ہیں۔ کس کی پارٹی میں کون گیا اور کس نے کیا پہنا اور کیا نہیں پہنا۔ اس صفحہ کی وجہ سے اخبار کو اشتہارات کی شکل میں کافی منافع بھی ملتا ہے اور شہرت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ماھوی (کونکونا شرما) اس سب کو صحافت کا حصہ بھی سمجھتی ہے اور سماجی ذمہ داری کے طور پر صحافت میں آگے بھی جانا چاہتی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ آج کل میڈیا بھی ایک بزنس بن گیا ہے۔ پیسہ دے کر خبریں لگوائی جاتی ہیں اور اگر پیسہ نہ دو تو خبر کی اصل شکل بگاڑ دی جاتی ہے۔

فلم کا پہلا حصہ بہت زیادہ طاقتور نہیں مگر فلم ڈائریکٹر (مادھور بھنڈارکر) نے بہت خوبصورتی سے مختلف کہانیوں کو بننا شروع کیا۔ اونچی سوسائٹی کے لوگوں کے کیا مسائل ہیں، کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ مل کر وہ آگے سے آگے جاتے ہیں اور بڑے لوگوں کے ڈرائیور جو کہ عام آدمی ہیں وہ اپنے صاحبوں اور ان بڑے لوگوں کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں، یہ ایک کڑوا سچ ہے جو بہت خوبصورتی سے اس فلم میں مزاح کے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اونچی سوسائٹی جس میں بزنس مین، سیاست دان حکومتی اداروں کے لوگ، فیشن اور فلمی دنیا کے تمام لوگ شامل ہیں ان کی زندگی کیا ہے اور میڈیا ان کا کیا رنگ دکھاتا ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف بدلتے ہوئے کلچر کو میڈیا کس طرح پروموٹ کرتا ہے یہ سب کچھ فلم ڈائریکٹر (مادھور بھنڈارکر) نے بہت اچھے انداز میں دکھایا ہے۔

فلم کے دوسرے حصہ میں اتل کلکرنی (وینا یک) ایک کرائم رپورٹر ہے جو ایک پروفیشنل اور کسی حد تک سچا اور ایماندار صحافی کے طور پر سامنے آتا ہے۔ صحافت کا ایک اور رنگ سامنے لایا جاتا ہے جس میں زندگی کی سچائیوں اور حقیقتوں پر مبنی تحقیقاتی کہانیاں ہوتی ہیں۔ اچھی یا اصلی صحافت کیا ہوتی ہے، کتنی مشکل ہوتی ہے، کس کے لئے ہوتی ہے اور صحافت کو کیسے استعمال کیا جاتا ہے۔ صحافی کے ساتھ پھر کیا ہوتا ہے؟ صحافت کے اس مثبت پہلو کو بھی اجاگر کیا گیا ہے کہ اگر ہماری حکومتیں اس کا صحیح استعمال کریں تو سماج میں موجود برائیوں کو ختم یا کم کیا جاسکتا ہے۔

فلم میں ایکٹنگ کا معیار کافی بہتر ہے۔ ماھوی (کونکونا شرما) جو ایک بہترین اداکارہ ثابت ہو رہی ہیں بہت خوبصورتی سے اپنے رول کو نبھاتی ہیں۔ اتل کلکرنی (وینا یک) اور بومان ایرانی (دیپک) تو پہلے سے ہی منجھے ہوئے اداکار ہیں۔ ہندی فلم سینما کے حوالے سے ڈائریکٹر (مادھور بھنڈارکر) نے فلم بینوں کے لئے تمام ضروری مصالحے بھی رکھے ہیں جن میں جذباتی مناظر، مزاح، ایکشن اور سیکس شامل ہیں ہر سین کو اس کی ضرورت کے مطابق نہایت مناسب انداز میں فلم میں جگہ دی گئی ہے۔

جیسے ہمارا میڈیا صرف رنگوں کی تلاش میں رہتا ہے اور قاری کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے دور ایک سہانی دنیا ہی دکھاتا ہے اسی طرح یہ فلم بھی پارٹیز اور ان میں شامل Party Aminals کے گرد ہی گھومتی ہے۔ عام آدمی کو اس فلم میں اتنا ہی حصہ دیا گیا ہے جتنا کہ ہمارا میڈیا اور صحافت اپنے اخبار یا ٹی وی چینل میں دیتے ہیں اور یہ ڈائریکٹر (مادھور بھنڈارکر) کا کمال ہے۔

اس فلم کو آج کے میڈیا اور صحافت کا بردشر کہنا غلط نہ ہوگا۔

فراز

12 جنوری 1931 تا 26 اگست 2008

انتساب

ہماری چاہتوں کی بُزدلی تھی
ورنہ کیا ہوتا
اگر یہ شوق کے مضموں
وفا کے عہدنامے
اور دلوں کے مرثیے
ایک دوسرے کے نام کردیتے
زیادہ سے زیادہ
چاہتیں بدنام ہو جاتیں
ہماری دوستی کی داستانیں عام ہوجاتیں
تو کیا ہوتا
یہ ہم جو زیست کے ہر عشق میں سچائیاں سوچیں
یہ ہم جن کا اثاثہ، تشنگی، تنہائیاں، سوچیں
یہ تحریریں
ہماری آرزو مندی کی تحریریں
بہم پیوستگی اور خواب پیوندی کی تحریریں
ہم ان پر منفعل کیوں ہیں
یہ تحریریں
اگر اک دوسرے کے نام ہوجائیں
تو کیا اس سے ہمارے فن کے رسیاء
شعر کے مداح
ہم پر تہمتیں دھرتے
ہماری ہمدمی پر طنز کرتے
اور یہ باتیں
اور یہ افواہیں
کسی پہلی نگارش میں
ہمیشہ کے لئے مرقوم ہو جاتیں
نہیں ایسا نہیں ہوتا
اور اگر بالفرض ایسا ہو تا بھی
تو پھر ہم کیا
سبُک سارانِ شہر حرف کی چالوں سے ڈرتے ؟
سگانِ کوچہ شہرت کے غوغا
کالے بازاروں کے دلالوں سے ڈرتے ؟
ہمارے حرف جذبوں کی طرح
سچے ہیں، پاکیزہ ہیں، زندہ ہیں
بلا سے اگر ہم مصلوب ہوجاتے
یہ سودا کیا بُرا تھا
گر ہماری قبر کے کتبے
تمہارے اور ہمارے نام سے منسوب ہوجاتے !

“Crisis-driven media can not afford to hang about for too long. As a business needs cash turn-over, the media need crisis turn-over and are engaged in crisis production that seeks to find ways of manufacturing them in easily consumable, spectator-friendly formats... We must liberate ourselves from the tyranny of crisis reportage.”

Arundhati Roy

”بحرانوں (crisis) پر چلنے والا میڈیا بحران کے بغیر زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ جس طرح
کاروبار کے لئے کیش ٹرن اوور کی ضرورت پڑتی ہے، میڈیا کے لئے بھی کرائسس ٹرن اوور
ضروری ہوتا ہے اور وہ بحران تشکیل کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ ایسے بحرانوں کی تشکیل کے
طریقے تلاش کرتا ہے جو قابل قبول ہوں اور ناظرین کے لئے ’تماشے کا لطف‘ مہیا کر سکیں۔
ہمیں خود کو کرائسس رپورٹنگ کے جبر سے آزاد کرانا ہوگا۔“

اروندھتی رائے

Society for Alternative Media and Research

With the Co-opration of: FRIEDRICH EBERT STIFTUNG